

نگہت سیما ماء الملوك

لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اور والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گرانٹ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شازیب اور ظفر یاب کے ساتھ رہتے تھے۔ اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ ظفر یاب کا ایک بیٹا آفرین تھا اور شاہ زیب بیگ کی ایک بیٹی زل بھی آفرین اور زل کا نکاح ہو چکا تھا۔ شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفر یاب کی کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفر یاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

زہرا کی سوتیلی ماں اس کی شادی ایک پیسے والے بوڑھے زمین دار سے کر رہی تھی اس کے بیٹے بہو ویں پوتا پوتی سب اس سوتیلی پر آتے ہیں۔ زہرا کا باپ اسے بھگا کر اپنے دوست کے بیٹے سے اس کی شادی کر دیتا ہے۔ ماسٹر عبدالعزیز اس کا شوہر اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ ان کی ایک بیٹی ہوتی ہے زیب النساء، ماسٹر صاحب کو اسے پڑھانے کا بہت شوق ہوتا ہے زہرا کہتی ہے کہ اس کے لیے ماسی نور بھری اپنے بیٹے کا رشتہ لانی ہے۔ ماسٹر صاحب منع کر دیتے ہیں۔

زہرا کا ایک بیمار ہو کر انتقال کر جاتی ہے۔ اس موقع پر استانی جی ان کا بہت ساتھ دیتی ہیں۔ استانی جی کے ہاں اقبال کا کوئی جاننے والا شہری آتا ہے وہ زہرا پر فریضہ ہو جاتا ہے۔ ماسٹر صاحب اپنی بیماری کی وجہ سے پریشان ہیں زہرا کی شادی اپنی زندگی میں کرنا چاہتے ہیں ابھی شہری ان سے رشتہ مانگتا ہے اور کہتا ہے میرے والدین سچ پر گئے ہیں ان کے آتے ہی میں ان کو لے آؤں گا۔

ماسٹر صاحب کو دل کا دورہ پڑتا ہے وہ ہسپتال میں ہوتے ہیں اتفاقاً وہ ابھی آتا ہے اس کا نکاح زہرا سے ہو جاتا ہے۔

اختر بانو مرزا جہاں زیب بیگ کی اکلوتی بیٹی ہیں جن کی شادی ان کے دوست سلطان کے بیٹے ثوبان سے ہوتی ہے۔ ثوبان سمیت کوئی بھی اس شادی سے خوش نہیں ہوتا ثوبان کی دوسری شادی اس کی کزن ثمرہ سے ہو جاتی ہے۔ اختر بانو کا بیٹا شایان ثمرہ کو دے دیا جاتا ہے۔

اختر بانو کو دل کی تکلیف ہوتی ہے تو شایان ان کے قریب آ جاتا ہے ثمرہ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شایان امان کے ساتھ لاہور آ جاتا ہے۔ دسویں قسط۔

حضرت اپنی پریشانی اس سے چھپائیں پار ہے تھے۔ پوچھوں گی کہ خط کیوں نہیں لکھا، ابا اتنے پریشان تھی ابا! جب آئیں گے تو میں ضرور ان سے کہوں گی۔



”وہ ماسٹر صاحب!“ اقبال کھنکارا۔
”میں لاہور گیا تھا اس بارہ دن پہلے تو مجھے آپ کے داماد کی موت کا پتا چلا تھا۔ بے چارے کا ایکسٹنٹ ہو گیا تھا جگہ پر ہی مر گیا۔“

وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے جس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی تھی۔

”میں تو سمجھا تھا آپ لوگوں کو کلمہ ہوگا۔ زیب کو تو وہ ساتھ ہی لے کر گیا ہوگا۔ بیوی بھی بھلا یہاں کیوں چھوڑ کر جاتا یہ تو خالہ نے بتایا کہ اسے آنا تھا لیکن پھر نہ وہ آیا اور نہ ہی کوئی خبر آئی اس کی۔ میں تو جی حیران ہی رہ گیا۔ اس کی تو موت کو بھی میں پہچیں دن ہو گئے ہوں گے۔ سچ تو مجھے پتا نہیں۔ مجھے تو وہاں لاہور میں اس کا دوست ملا تھا وہ ہی جس کے ساتھ وہ شکار کے لیے آیا تھا اس نے ہی بتایا تھا کہ کسی دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا، ٹرک نے چل دیا دونوں کو۔“

وہ دل پر ہاتھ رکھے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”اخبار میں بھی خبر چھپی تھی۔ آپ نے شاید دھیان نہیں دیا ہوگا۔“ وہ اب گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
وہ کہاں روز اخبار پڑھتے تھے۔ نیاز شہر جاتا تو لے آتا تھا۔

استانی جی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وہ انہیں بھی تو کتنا عزیز ہو گیا تھا۔ کتنا مہذب اور ادب و احترام کرنے والا تھا، وہ پھر آئی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ بڑی دیر بعد ان کے لبوں سے تو نے تو نے لفظ نکلے تھے۔

”ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا ماسٹر صاحب یہ بھی ہو سکتا ہے ابھی ہم یہاں بیٹھے بیٹھے اگلے جہاں روانہ ہو جائیں۔“ وہ عجیب طرح سے مسکرایا تھا۔

”تم وہاں جا کر اس بڑے شہر میں رہ کر اپنے ابا کو بھول نہ جانا۔“ وہ یوں ہی دل بہلانے کو باتیں کر رہے تھے دل جو واہوں اور اندیشوں میں گھرا تھا۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں ابا! میں بھلا آپ کو بھول سکتی ہوں۔“ اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا تھا۔

”کیا خبر نے رشتہ داروں میں جا کر تمہیں اپنا یہ غریب ماسٹر ایسا ہی نہ آئے۔“

تب ہی دروازہ کھلا تھا اور استانی جی کچھ گہرائی ہوئی سی اندر داخل ہوئی تھیں۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے تھے، ان کے ساتھ آنے والا اقبال دروازے کے پاس ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”میرے ساتھ اقبال بھی آیا ہے ماسٹر صاحب۔“

وہ بوکھلائی سی تھیں۔ انہوں نے زیب التسا کی طرف دیکھا تھا جو اپنا دوپٹہ درست کرتی کمرے میں چلی گئی تھی۔

”آجاؤ اقبال بیٹا!“ انہوں نے اقبال کو بلا لیا تھا۔ وہ خاموشی سے آکر چارپائی کے سامنے بڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ استانی جی بھی پریشان سی ایک طرف کھڑی تھیں۔

”بیٹھ جائیں آپا جی!“ انہوں نے ذرا قاصدے پر دائیں طرف پڑے موڑے کی طرف اشارہ کیا۔
”سب ٹھیک ہے نا، خیریت ہے نا، آپ پریشان لگ رہی ہیں۔“

”ہاں وہ ماسٹر صاحب خیریت تو نہیں ہے۔ یہ اقبال۔“

وہ اقبال کی طرف دیکھنے لگیں۔ آنکھوں میں نمی سی پھیلنے لگی تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز پریشان سے باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”میری زیب التسا کی خوشیوں کی عمر اتنی مختصر تھی۔“

آنسوؤں نے ان کی پھرائی ہوئی آنکھوں میں نرمی پیدا کی اور پھر وہ رخساروں پر پھسل آئے تو اقبال اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا اور ایک بازو ان کے گرد حماں کر کے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔ وہ اس کا سہارا پاتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ تھے۔ استانی جی دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر زیب التسا کے پاس چلی گئی تھیں۔ حامد خیند میں کسسا اور ای آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تو وہ چونک کر اسے پھپھکنے لگے۔

زیب التسا کچھ دیر سوئے ہوئے حامد کو دیکھتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ابھی کچھ دیر سوتا رہے گا خیند پوری نہیں ہوئی اس کی۔ میں ذرا ہانڈی چڑھا دوں اور آنا گوندھ کر رکھ دوں۔ جاگ گیا تو پھر گودے اترے گا ہی نہیں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

”کاش میں جلد بازی نہ کرتا۔ اس کی عمر کی لڑکیاں تو ابھی گھروں میں بیٹھی ہیں۔ لیکن میرے واہوں اور خوف نے مجھ سے جلد بازی کروائی کیا تھا اگر میں اس کی شادی نہ کرتا۔ پڑھتی رہتی۔ بارہ کر سکتی تو شہر جا کر ہوشل میں داخل کروا دیتا یہ میرا ڈر۔ ساری غلطی میری ہے۔ لیکن نہیں میں کیا اور میرے ارادے کیا۔ تقدیر میں یہ ہی لکھا تھا۔ یہ آزمائش آئی ہی تھی۔ یہ دکھ جھیلنا نصیب میں لکھا تھا۔

وہ بد نصیب اتنی ہی عمر لکھوا کر لایا تھا۔ پتا نہیں بے چارے کے ماں باپ کا کیا حال ہوگا بچے کی جواں عمر کی پر کیسے ترستے ہوں گے۔ میرا حامد چھوٹی عمر میں ہی چلا گیا تھا لیکن کیسے ترپتے تھے ہم دونوں مہینوں تک راتوں کو ٹھیک سے خیند نہیں آتی تھی آدھی رات کو اٹھ کر رونے لگتے تھے۔

کچھ دنوں بعد وہ ذرا سے سنبھلے تو انہیں خیال آیا تھا کہ انہیں زیب التسا کو لے کر اس کے سرال میں

جانا چاہیے۔ بہو ہے ان کی اور پھر ماں بننے والی ہے۔ اگر اس نے ابھی تک اپنے والدین سے ذکر نہیں کیا ہوگا تب بھی بیٹے کی نشانی کاسن کر ضرور ہوگی گلے لگا لیں گے۔ بیٹے کی ہونے والی اولاد کے متعلق جان کر شاید ان کی تڑپ میں کچھ کمی آجائے۔ وہ کتنی تعریف کرتا تھا اپنے ماں باپ کی۔

☆☆☆

اس روز استانی جی اور اقبال ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔ استانی جی تو ان دنوں ہر روز ہی گھر کے کاموں سے قاصر ہو کر آ جاتی تھیں۔ انہیں زیب التسا کی حالت ٹھیک نہیں لگتی تھی کبھی تو وہ سارا دن خاموش بیٹھی رہتی۔

کھانے بیٹے کا بھی ہوش نہ ہوتا استانی جی زبردستی منہ میں تولیے بنا کر ڈالیں اور کبھی بیٹھے بیٹھے جو روئے لگتی تو پھر روئے ہی چلی جاتی۔

استانی جی اس پاس کی کچھ بچیوں کو بلا کر قرآن پڑھنے بیٹھیں تو اس کے ہاتھ میں بھی سارہ کچڑا دیتیں لیکن وہ سارہ گود میں رکھے بس خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ اس روز بھی استانی جی آئی ہوئی تھیں۔ ماسٹر عبدالعزیز بھی گھر پر ہی تھے کہ اقبال جو اپنے کسی کام سے ان سے ملے آیا تھا۔ ان کے گھر تالا دیکھ کر ادھر ہی چلا آیا تھا اور ماسٹر عبدالعزیز نے اسے اندر ہی بلا لیا تھا۔ اور وہ جوکل سے سوچ رہے تھے کہ انہیں زیب التسا کو لے کر ایک بار تو اس کے سرال ضرور جانا چاہیے۔ اپنی سوچ کا اظہار استانی اور اقبال کے سامنے کیا تا کہ ان کی رائے بھی معلوم ہو سکے۔ استانی جی کو ان کی بات سچ لگی تھی۔

”آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں ماسٹر صاحب! ایک بار تو آپ کو ضرور جانا چاہیے۔ زیب التسا کے لیے نہ سبھی اس کے ہونے والے بچے کے لیے تمہارا کیا خیال ہے اقبال، تمہیں کچھ اتنا پتا ہے اس کے گھر کا۔“ استانی جی اب اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”نہیں، مجھے تو کچھ علم نہیں۔“ وہ جیسے چونکا تھا۔ اور ماسٹر صاحب اتنے بڑے شہر میں بھلا کہاں

ہاٹی دیکھ لیتا ہوں۔“ انہوں نے حامد کو زیب التسا کے حوالے کیا جو ماں کی طرف لپک رہا تھا۔
”وال پکنے کے لیے دھیمی آج پر رکھ دی ہے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

زیب التسا نے حامد کو لیتے ہوئے اس کی آنکھوں کو اور خساروں کو چوما۔ آنکھیں جو بالکل اس جیسی تھیں۔ خوب صورت سحر طاری کرنی مغل شہزادوں جیسی آنکھیں۔

اور پھر اسے لے کر کمرے میں چلی گئی۔ ماسٹر عبدالعزیز کچھ دیر کھڑے رہے پھر واپس چارپائی پر بیٹھ گئے۔

”شکر ہے اللہ کا کہ اس نے زیب التسا کو حامد دے دیا۔ زندگی گزارنے کا آسرا اور جواز مل گیا ہے اسے۔“ ورنہ انہیں تو لگتا تھا جیسے وہ جی نہ پائے گی کسی روز اچانک آنکھیں بند کر لے گی۔ سارا دن خاموش چپ چاپ بڑی رہتی تھی۔ استانی جی نے سگی ماں کی طرح ہی اس کا خیال رکھا تھا۔ جب حامد پیدا ہوا تھا تو وہ اسے اپنے ساتھ ہی کمرے لگتی تھیں۔ اور پورا ایک ماہ اپنے گھر ہی رکھا تھا۔

”کمزور ہے ابھی اسے دیکھ بھال کی ضرورت ہے ماسٹر صاحب! پھر ابھی اسے بچے کو سننا لانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں آتا۔ اسے ہر وقت کسی کی ضرورت ہے۔ میں آپ کی طرف وقت کے وقت آتی ہوں گھر میں بچیاں دو وقت قرآن پڑھنے آتی ہیں۔ آپ بھی اب کیسے ہر روز اسکول جاتے ہوئے اسے چھوڑ کر حائیں اور پھر رات کو لینے آئیں تو بہتر ہے کہ میں اسے گھر ہی لے جاؤں۔“

اور وہ ان کے بے حد ممنون ہوئے تھے۔
”میں عمر بھر آپ کا احسان مند رہوں گا آج بھی۔ آپ نے زہرا کے بعد میری بچی کو ماں کی محسوس نہیں ہونے دی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں ماسٹر صاحب میرے لیے۔ زیب التسا فاطمہ جیسی ہی ہے۔ پہلے بھی آپ سے کہا تھا۔“

اور انہوں نے حامد کی پیدائش پر پہلی بار اسے دنوں کے بعد اسے پر سکون دیکھا تھا اور اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور زیب التسا سے پوچھ کر ہی اس کا نام حامد رکھا تھا۔

”اگر تم نے کوئی نام نہیں سوچا تو تمہارے بھائی کے نام پر اس کا نام رکھ دیں۔“

”جی ابا!“ اس نے اعتراض نہیں کیا تھا۔

حامد کی پیدائش کے بعد اس کی خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اب وہ باتیں بھی کرنے لگی تھی۔ گو بہت زیادہ نہیں لیکن کرتی تھی۔ گھر کے کام بھی پہلے کی طرح کرنے لگی تھی۔ نور بھری کی طرف سے بھی ان دنوں وہ مطمئن تھے کہ وہ گھر خالی کر کے اپنے بیٹے کے ساتھ راجن پور چلی گئی تھی۔ استانی جی بھی دن میں ایک آدھ چکر لگاتی تھیں تو وہ اسکول چلے جاتے تھے۔ اپنے طور پر انہوں نے رحیم یار خان جا کر خود بھی مظلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ نکاح نامے میں اس کے گواہوں کا پتا موجود تھا۔ ایک تو اس کا وہی دوست تھا اور دوسرے اس کے والد تھے۔ اقبال نے صح بتایا تھا کہ وہ لوگ رحیم یار خان سے چلے گئے ہیں ایک پڑوسی نے بتایا تھا کہ وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ لیکن زیب التسا کو پتا نہیں کیوں اقبال کی بات کا یقین نہیں تھا۔

”میرا دل کہتا ہے ابا کہ وہ زندہ ہیں۔ اقبال بھائی نے جھوٹ بولا ہے۔“

”لیکن اقبال جھوٹ کیوں بولے گا؟“ پہلی بار جب اس نے کہا تو وہ حیران ہوئے تھے۔

”پتا نہیں لیکن بس بھی مجھے لگتا ہے کہ وہ ہیں۔“ وہ خود وضاحت نہیں کر پائی تھی کہ کیوں لیکن اس کے اندر اس کے آجانے کی امید ختم نہیں ہوئی تھی۔

”فرض کرو اقبال نے غلط بیانی کی ہو تو کیا وہ تمہیں لینے نہ آتا، وعدہ کیا تھا نا اس نے کہ وہ جلد ہی اپنے ماں باپ کو لے کر آئے گا۔ تو کیا تمہیں لگتا ہے زیب التسا کہ اس نے ہم سے جھوٹ بولا۔ دھوکا کیا۔“

وہ ایسا نہیں تھا بھئی۔ وہ تو شکل و صورت اور اطوار سے اعلیٰ خاندان کا لگتا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا ضرور آتا۔“ وہ اسے سمجھاتے تو وہ جب ہو جاتی تھی۔ لیکن چند دنوں بعد وہ پھر ایسی ہی کوئی بات کر دیتی تھی۔ اب تو حامد بھی آٹھ ماہ کا ہو گیا تھا اور ایک بار پھر وہ اس کے لیے پریشان رہنے لگے تھے کہ ماسی نور بھری ایک بار پھر گاؤں واپس آگئی تھی اور دیور سے جانے کیا روٹا روٹا تھا کہ اس نے اپنا گھر اسے ہی رہنے کے لیے دے آیا تھا۔ خود تو وہ چند دن بھی گاؤں میں نہیں رہا تھا کہ جی۔ نے اورھر رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے راہ چلتے اورھر اسے سنا تھا کہ بیوے لڑ بھڑ کر آگئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اسلم نے راجن پور میں کسی سے شادی کر لی تھی اور وہاں ہی رہ رہا تھا۔ انہیں ایک دن راستے میں ہی روک کر افسوس کرنے لگی تھی۔

”بڑا افسوس ہوا ماسٹر جی! تمہارے داماد کی موت کا سن کر تم نے تو بڑا فاسرڈ چھوڑا تھا جی بھئی کے نصیب میں نہیں تھا۔ بڑے افسر کی بیوی بن کر عیش کرنا۔ اللہ کی مرضی۔“

اور کہتے ہی دن تک اس کا طزیہ لہجہ انہیں تکلیف دیتا رہا تھا۔ استانی جی نہیں تھیں جن سے دل کا حال کہہ کر وہ مطمئن ہو جاتے سوا ایک روز وہ چوہدری عبدالملک کی طرف چلے گئے تھے۔ جن کے بچوں کو اب وہ نہیں پڑھاتے تھے۔

چوہدری عبدالملک نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر زیب التسا کی شادی کر دیں۔ وہ ابھی کم عمر ہے۔ جوان ہے، اتنی لمبی زندگی تمہاری کیسے گزارے گی۔ پھر ہمارے دین میں بھی بیوہ کی شادی کر دینے کو کہا گیا ہے۔ تب سب سے پہلے انہیں اقبال کا ہی خیال آیا تھا۔ وہ خواہش مند تھا۔ اس کے متعلق وہ جانتے تھے۔ خاندان گھریار سب کا پتا تھا۔ سو وہ ایک روز اس کے گھر چلے گئے تو اس کے بھائیوں کو خود اس کی خبر نہیں تھی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ کسی ایجنٹ کو رقم دے کر جرمنی جانے کے لیے

گھر سے نکلا تھا لیکن پھر جرمنی پہنچا نہیں انہیں کچھ خبر نہیں تھی۔ اس نے نہ کوئی خط لکھا تھا نہ ہی ڈیڑھ سالوں میں کسی اور ذریعے سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ اقبال کی طرف۔ سے مایوس ہو کر انہوں نے اسے دو کوئیکز سے بھی کہہ رکھا تھا۔ لیکن ابھی تک کسی نے کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں بتایا تھا۔ اور اگر کوئی رشتہ مل بھی جاتا تو زیب التسا کی بھی صورت شادی کے لیے تیار نہ ہوتی کہ انہوں نے ایک روز یوں ہی شادی کا سرسری سا ذکر کیا تھا تو اس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اسے شادی نہیں کرنی۔

”لیکن تمہارا زندگی کیسے گزر دی۔“ انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”میرا بیٹا ہے نا، میرا حامد، میرا شہزادہ۔“
”یہ ابھی بہت چھوٹا ہے زیب التسا۔“ وہ چاہتے تھے جلد از جلد اس کی شادی کر دیں۔

”آپ ہیں نا۔ بس آپ مجھ سے وعدہ کریں آپ مجھے بھی شادی کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔“

اور وہ خاموش ہو گئے تھے کہ شاید کچھ وقت گزر جائے تو اسے سمجھ آ جائے لیکن اندر سے ان کا دل کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ موت کے قدموں کی چاب چاہتے آس پاس سنائی دینے لگی تھی۔ اس پر نور بھری کا کچھ واپس آکر پڑوس میں رہنے لگتا پچھلے دنوں انہوں نے اسلم کو بھی دیکھا تھا تو گھبرا کر زیب التسا سے کہہ دیا تھا کہ انہیں اگر کچھ ہو جائے تو وہ آپا بھٹاں کے پاس چلی جائے اور وقت فوقتاً اپنی بات دہراتے رہتے انہوں نے رخ موڑ کر کمرے کی طرف دیکھا۔ زیب التسا کمرے میں ہی تھی اور کمرے سے حامد کی تھکتا، یوں کی آوازیں آرہی تھی۔ چند لمبے وہ یونہی بے خیال میں دیکھتے رہے پھر چارپائی پر لیٹے ہوئے رخ دیوار کی طرف کر لیا۔ آنکھوں میں می ٹپیل گئی۔

”بالذبحہ اتنی حیاتی دینا کہ میرا حامد اتنا بڑا ہو جائے کہ مجھے دنیا سے جاتے ہوئے بیٹی کے تہوارہ جانے کا دکھ نہ ہو۔ میری بیٹی بہت معصوم ہے اسے مل چھل نہیں آتے یہ دنیا کی مکاریوں کو نہیں سمجھ سکتی میرے اللہ۔“ آنسوؤں کی آنکھوں سے نکل نکل کر تکیہ بھگونے لگے تھے۔ انہوں نے بھی شکوہ نہیں کیا تھا ہمیشہ اللہ کی رضا پر راضی رہے تھے لیکن اس وقت وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے تو کبھی کسی کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا بلکہ کسی کے لیے برا سوچا تک نہیں۔ زہرا بھی تو ایسی تھی۔ سب کے ساتھ بہت اچھی پھر ہماری بیٹی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ اور انہیں یاد آیا کہ ایک بار استانی جی نے کہا تھا۔

”ماسٹر صاحب! اللہ کے بے حد پیارے اور نیک بندوں پر بھی مصیبتیں آتی ہیں۔ شاید یہ ان کی آزمائش ہوئی ہے۔“

”یا اللہ یہ اگر آزمائش ہے تو اب اور نہ آزمائنا ہمیں۔ ہم تیرے بہت کمزور بندے ہیں۔ برداشت کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمیں ہماری بہت سے زیادہ نہ آزمائنا۔ انہوں نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے اور ایک بار پھر اللہ سے اپنی صحت و زندگی کے لیے دعا کرنے لگے لیکن سب دعائیں قبول نہیں ہوتیں کچھ دعاؤں کا اجر آخرت کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

جب وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے تھے کہ اب انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ اور سکون سا آ گیا تھا۔ ان کے اصرار پر زیب التیہ ایک بار پھر ایف اے کا امتحان دینے کے لیے پڑھنے لگی تھی کہ فرشتہ اجل آپہنچا۔ وقت پورا ہو گیا تھا۔ حامد دو سال کا ہو گیا تھا۔ وہ اسکول سے آتے تو دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں باہر لے جانے کا کہتا اور وہ بھی بغیر سانس لیے اسے اٹھا کر باہر لے جاتا تھا۔ چہرہ لگانے لے جاتے تھے اور روز بھی وہ اسکول سے آکر پار پائی پر بیٹھے تھے اور حامد ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے کھڑا تھا۔

”زیب بیٹی میں ذرا حامد کو باہر لے جا رہا ہوں تم دروازے کو کھلی لگو۔“

وہ جھک کر حامد کے جوتوں کے تھے باندھنے لگے تھے۔

”ابا آپ اسکول سے تھکے ہوئے آتے ہیں اسے تو سمجھ نہیں ہے آپ کچھ دیر آرام کر لیا کریں۔“

زیب التیہ اور جی خانے سے باہر نکلی اور دوپٹے کے پلو سے گیلے ہاتھ پونچھتی ہوئی انہیں دیکھ رہی تھی کہ یکدم وہ سیدھے ہوئے اور پچھے گر گئے۔

”ابا..... ابا کیا ہوا؟“ وہ بھاگ کر برآمدے میں آئی ان کی آنکھیں بند تھیں۔ لب آہستہ آہستہ مل رہے تھے۔

”ابا!“

اس نے ان کی ٹانگیں اٹھا کر چار پائی پر رکھیں اور انہیں سیدھا کر کے لٹایا تو انہوں نے کچھ بھر کے لیے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ایک ہچکی آئی اور آنکھیں ہولے ہولے بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے کونے پر خنسا سا آنسو آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ پچھی پچھی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ستمبر کا وسط تھا اور موسم بے حد خوش گوار ابھی کچھ دیر پہلے فضا میں ہلکی حدت تھی لیکن عصر کے فوراً ہی بعد موسم بے حد اچھا ہو گیا تھا ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اوپر نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں وہ اپنی مخصوص سبز سیوں پر بیٹھی بی بی اماں کو کھن میں کرسیاں لگاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی حشر بھی ہوئی تھی۔

”میرے خیال میں اتنی کرسیاں کافی ہوں گی۔“

بی بی اماں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور انہیں کچن کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے لگی اور پھر خاموش بیٹھی حشر کی متوجہ ہوئی۔

”تمہاری یونیورسٹی کیسی چل رہی ہے؟“

”چل تو نہیں رہی ابھی جگہ کھڑی ہے۔ اسی وقار اور شان کے ساتھ۔“ وہ مسکرائی۔

”ویسے اگر تمہاری مراد میری پڑھائی سے ہے تو اے دن ایک کے سوا سب اساتذہ بہت عالم و فاضل ہیں کچھ کے پچھرو تو میرے سر کے اوپر سے گزر جاتے ہیں لیکن خیر آہستہ آہستہ سمجھ آ جائے گی۔“

وہ بی ایس سی کر کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے چکی تھی اور ان دنوں اس کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔ وہ اکثر نیچے زل کے پاس آنے لگی تھی اور پچھلے تین چار ماہ سے وہ مرسل کی بے نام تنظیم کی میٹنگز میں بھی شامل ہونے لگی تھی بلکہ پچھلے ماہ اس نے اپنی پاکٹ مانی میں سے کچھ رقم بچا کر تنظیم کے فنڈ میں بھی جمع کروائی تھی۔ اور صرف وہ ہی نہیں کبھی کبھی مرنسی ماہ ویش اور مہرین بھی نیچے آ جاتے تھے اور خلوص دل سے مشورے دیتے تھے جبکہ میونسوہ اور رخسانہ کو بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا ان کا نیچے جانا۔

میٹنگز میں صرف مسائل کا ہی ذکر نہیں ہوتا تھا بلکہ اب وہ ایک طرح کی ادبی میٹنگ ہی بن گئی تھی۔ خاص طور پر جب سے وجدان احمد اور عمر اعجاز نے آنا شروع کیا تھا۔ میٹنگز کا ایجنڈا ختم ہونے کے بعد ہر طرح کے موضوعات زیر بحث آتے تھے کبھی کبھار جہاں زیب بیگ اور بی بی اماں بھی آکر بیٹھ جاتے تھے۔

جہاں زیب بیگ جب کسی موضوع پر بات کرتے تو جیسے علم کا دریا تھا جو بہتا چلا جاتا۔ اماں اور شایان نے بھی جب سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا وہ بھی باقاعدگی سے آنے لگے تھے۔ بے حد بور اور اکتا دینے والے دنوں کے بعد یہ دن زل کو ہوا کے خوش گوار جھونکے کی طرح لگتا تھا۔ اور اگلے کئی دن تک وہ اس کی خوش گوار ریت کو محسوس کرتی تھی۔

جہاں زیب بیگ کے بے حد اصرار کے باوجود شایان اور اماں ان کے ہاں نہیں ٹھہرے تھے بلکہ انہوں نے ایک فرزند فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔

جہاں زیب نے آخر بانو سے گلہ کیا تو انہوں نے وضاحت کی کہ اگر صرف اماں ہوتا تو اسے تو آپ کے پاس ہی ٹھہرنا تھا۔ لیکن شمرہ آپ کو پسند نہیں ہے کہ

شایان ہماری حویلی میں رہے۔ ان کی وجہ سے ہی اماں کے بابا جان نے الگ فلیٹ کے لے کر دیا ہے۔ یہاں سے ایک ملازم بھی ساتھ کر دیا ہے۔“

”لیکن شمرہ اور ثوبان کو تو پتا ہے تاکہ وہ بھی ہمارا ہی ہے پھر بھی۔“ جہاں زیب بیگ افسردہ ہوئے تھے۔

”شمرہ آپا کے اپنے ڈر اور خوف ہیں ابا جان! آپ افسردہ نہ ہوں میں نے مانی سے کہا ہے وہ ہر ویک اینڈ پر آجایا کرے گا۔ شانی سوڈی ہے۔ اگر اس کا موڈ ہوا تو وہ بھی آجایا کرے گا اس کے ساتھ۔“

اور وہ دونوں ہی ہر ویک اینڈ پر آ جاتے تھے اور ان کے آنے سے زل کی زندگی میں ایک اور اچھے دن کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اماں اسے بڑی بہن کا سامان دیتا تھا اور وہ بھی اسے اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتی تھی۔

”زندگی میں ایک بہن کی کمی کبھی سو آپ نے پوری کر دی۔“

اس روز کھانے کی ٹیبل پر نہ جانے کس بات پر اس نے کہا تھا۔ ”اور مجھے بھی تمہارے روپ میں چھوٹا بھائی مل گیا ہے۔“ وہ بے حد خوش ہوئی تھی اماں اسے بہت اچھا لگا تھا۔ لکھا ہوا ہر ایک کا خیال اور احترام کرنے والا۔

”اب مجھے بڑا بھائی نہ بتا لیتا مجھے خواہ خواہ رشتے جوڑنے پسند نہیں ہیں۔“

شایان کے کیوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”آپ یوں بھی عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو۔“

شایان کی بات اسے تا گوار محسوس ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی ناگوار پیچھا لگی اور شایان بی بی اماں اور آفرین کے سامنے بے اختیار یوں بولنے پر دل ہی دل میں نادم ہوا تھا اس لیے اس نے فوراً سوڈی کر لیا تھا۔ وہ بس دم سا مسکرا دی تھی۔ آخر بانو نے اسے بتایا تھا کہ وہ کچھ خود سر، خود پسند اور مغرور سا ہے۔ شمرہ آپا کے بے جالاؤ پیار کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے۔ اگر کبھی اس کی بات بری لگے تو نظر انداز کر دیا کریں۔

اور جہاں زیب بیک نے انہیں تسلی دی تھی۔
”ہمارے لیے تو وہ بچہ ہی ہے اختر بانو، اور
بچوں کی باتوں کا کیا برامانا۔“
اور اس نے بھی کئی بار اس کی باتوں کو نظر انداز
کیا تھا۔

”کیا میرا مذاق برا لگا؟“ سحر بغور اسے دیکھ
رہی تھی۔
”نہیں تو۔“

وہ سحر کی بات سن کر حیران ہوئی تھی۔ سحر کو
پہلے تو بھی اس بات کی پروا نہیں ہوئی تھی کہ اس کی
بات کسی کو بری لگی ہے یا اچھی اسے جو کہنا ہوتا تھا کہہ
دیتی تھی۔

”بھلا اس میں برا لگنے والی کیا بات تھی۔“
”ہاں برا لگنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ میں
نے بھی بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ تم بتاؤ تمہارے
آزین صاحب کے کیا ارادے ہیں۔ پڑھائی تمہاری
ختم ہو چکی ہے اور آزین صاحب منہ بیٹھے بیٹھے ہیں۔
میرا تو خیال تھا کہ ادھر تمہارا آخری بچہ ہوا ادھر گھر
میں شادی بانیہ بجے لگیں گے۔ دادا جان تو کہتے تھے کہ
وہ جلد از جلد تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے
ہیں پھر؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”پتا نہیں۔“ زل نے افسردہ ہوئی۔

آزین تو ایسا ہی تھا ہمیشہ کی طرح کبھی یکدم اتنا
مہربان اور جنتیں لگاتا ہوا کہ اسے اپنی خوش قسمتی پر
رکھ آتا اور کبھی یکدم کم سم، خاموش اپنے آپ میں
گمن، ارد گرد سے بے خبر۔ سوائے سلام دعا کے کوئی
بات ہی نہ ہوتی۔ نہ جانے کن سوچوں میں گم رہتا
تھا ظفر یاب کے ساتھ بھی اس کا رویہ پہلے جیسے ہی
تھا۔ بھی ان کا فون آتا تو جہاں زیب بیک کے اصرار
پر ہیلو ہائے کر لیتا اور کبھی صاف انکار کر دیتا بات
کرنے سے۔

پتا نہیں کب وہ بالکل نارمل ہوگا اور اپنی ناراضی
ختم کر دے گا۔

”یہ دادا جان اس سے کہتے کیوں نہیں ہیں کہ

اب تمہاری رخصتی کر دالے اور نہ ہی چچا جان کچھ کہتے
ہیں اسے۔ ہماری میم (میڈم) کہتی تھیں کہ نکاح کے
بعد زیادہ عرصہ تک لڑکی کو گھر نہیں بٹھانا چاہیے۔ جلدی
رخصتی کر دینا چاہیے سو طرح کے پراہم ہو سکتے ہیں۔“
”مثلاً کیا پراہم؟.....؟“ زل نے دچکی سے
اسے دیکھا۔

”لڑکے اور لڑکی کا دل کہیں کسی اور جگہ اٹک سکتا
ہے۔ ہو سکتا ہے لڑکا انکار کر دے یا ہو سکتا ہے لڑکی منع
کر دے تو یہ تو اچھی بات تو نہ ہوتی نا۔“ سحر کے دل
میں جو بات آتی تھی کہہ دیتی تھی۔
”تم بے فکر رہو یہاں اس طرح کا کوئی مسئلہ
نہیں ہو سکتا۔ لڑکا، لڑکی دونوں کو ہی اپنے دلوں پر پورا
اختیار ہے بے قابو نہیں ہونے دیں گے۔“ وہ پورے
یقین سے مسکراتی تھی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو ڈیر زل! لیکن آنے
والے وقت کا کسی کو پتا نہیں ہوتا اس لیے میں خود دادا
جان اور بلکہ آزین سے کہتی ہوں کہ اب گھر میں کوئی
روقی شوق لگتی چاہیے۔ پورہ ہور ہے ہیں۔ شانے اور
ماہا کی شادی پر سلوائے گئے کپڑے جلدی اولڈ فیشن
کے ہو جائیں گے۔ جلدی شادی ہوگی تمہاری اور
آزین کی تو ایک دو تو وہ ہی چل جائیں گے۔“ وہ بڑی
پوڑھیوں کی طرح سنجیدگی سے کہہ رہی تھی زل کو بھی آ
گئی۔

”گھر میں روقی شوق چاہیے تو مرنقی بھائی بھی
تو ہیں نا۔ ان کو راضی کرونا شادی کے لیے۔ انہوں
نے کچھ بتایا نہیں اپنی پسند کے متعلق وہ جو مانا تمہاری
کراچی والی کزن کا ذکر کر رہی تھیں اس کے متعلق
پوچھنا تاہی اماں نے ان سے؟“

وہ بہت کم عمر تھی لیکن اماں نے کہا مرنقی کو پسند
ہے تو ٹھیک ہے۔ لڑکیاں لگتی بھی کم عمر ہوں۔ شادی
کے بعد خود ہی کچھ دار اور میچور ہو جاتی ہیں لیکن جب
انہوں نے مرنقی بھائی سے بات کی تو وہ اچھل ہی
پڑے کہ آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ کیا میں نے
اسے گود میں گھلانا ہے اور ایسی ہی فضول باتیں کیں۔

ایاں بے چاری تو حیران ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگی
تھیں۔ یہاں تو سب یہ ہی سمجھ رہے تھے کہ وہ کراچی
والی کزن میں انٹر سنڈ ہیں۔
لیکن سحر نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”اگر وہ وہاں انٹر سنڈ نہیں تھے تو پھر انہوں نے
مہرہ کے ساتھ شادی سے انکار کیوں کیا۔“ زل کو
حیرت ہوئی تھی۔

”ہماری مہرہ کتنی اچھی ہے۔ کتنا شفاف اور
یا کیرہ دل ہے اس کا اور پھر کتنی پیاری ہے وہ۔ تم بات
گرونا ان سے مہرہ جیسی لڑکی نہیں نہیں ملے گی۔ کیا پتا
انکار کر کے پچھتا رہے ہوں اور خود سے کہتے ہوئے
انا آڑے آتی ہو۔ تم تو کہہ سکتی ہونا ہر بات ان
سے۔“

”ہاں کہہ سکتی ہوں لیکن تم ابھی مرنقی بھائی کو
نہیں جانتی ہو۔ وہ اپنی بات سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔
اور مہرہ سے تو انہیں ہمیشہ سے ہی چڑ رہی ہے۔ نینکو
چارچھی اور جانے کیا کیا کہتے تھے اسے بس اماں اور
ہم لوگ ہی نہیں سمجھتے۔ پھر اب اگر انہیں کسی طرح منا
بھی لیا جائے تو نہ تاپا جان مانیں گے نہ مہرہ، وہ
بہت ہرٹ ہوئی ہے یار۔ بچپن سے ہی اپنے نام کے
ساتھ ان کا نام سنی آتی ہے تو محبت، انیسیت، لگاؤ کچھ
بھی کہہ لو کہ پیدا ہو جانا فطری ہے۔“

سحر یکدم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”خیر ہماری مہرہ کے لیے رشتوں کی کمی تو
نہیں ہے۔ آج کل کے دور میں ایسی ہیرو لڑکیاں
کہاں ہوتی ہیں۔ صاف دل، بے زبیا، مخلص۔“ زل
دل سے اس کی ان خوبیوں کا اعتراف کرتی تھی۔

”ہاں وہ بالکل تمہارے جیسی ہے۔ ورنہ آج
کل زیادہ تر لڑکیاں تو ہمارے جیسی ہوتی ہیں چالاک
، ہوشیار اور تھوڑی تھوڑی منافق۔“

بظاہر وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی لیکن اس کی
آنکھوں سے شرارت جھلکتی تھی۔

”یہ تم میری تعریف کر رہی ہو یا اپنی برائی۔“
زل کو اپنی باتوں سے وہ ہمیشہ ہی حیران کرتی تھی۔

”یہ تم اپنے بھائی کے لیے کہہ رہی ہو سحر۔
اللہ نہ کرے کہ کوئی چالاکو ماسی بقول تمہارے ان کی
زندگی میں آئے۔ اگلوں بھائی ہے تمہارا۔ کوئی چالاک
لڑکی آگئی نا تو کہیں تم لوگوں کی ہی چھٹی نہ
کر دالے۔“ اس نے مذاق کیا۔

”ہم تو خیر اپنے اپنے گھروں کو سدھار جائیں
گی پیچھے رہ گئیں مونا اماں تو تم کیا اپنی پیاری تانی اماں
کو نہیں جانتی ہو انہوں نے اس کی ہی چھٹی کر دوا دی
ہے۔ جب کہ ان کی مددگار رخسانہ خالہ پلس تانی بھی
موجود ہوں گی۔“ وہ اپنی اماں جان کو بھی نہیں بخشتی
تھی۔

”تم بھی نا سحر! زل مدھم سا مسکرائی۔
”جلدی سے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ لو مرنقی بھائی
کے لیے ورنہ وہ کوئی ایسی ویسی ہی پسند نہ کر لیں۔“
”اچھی لڑکیاں تو پہلے ہی بک ہو جاتی ہیں۔“

”وہ زرب لب پڑ پڑا لی اور سوچا۔ ویسے یہ اماں
اور رخسانہ خالہ کتنی تو سچ ہی تھیں کہ دادا جان نے سوچا
سمجھا کچھ نہیں اور لے کے نکاح کر دیا آزین کا زل
کے ساتھ ورنہ گھر کی لڑکیاں گھر میں ہی پٹ جاتیں۔
مہرہ یا شانزے کا آزین سے اور زل کا مرنقی سے
ہو جاتا تو۔“

اس نے مونا اماں کے چٹائے ہوئے جوڑوں
میں خود ہی ترمیم کر لی تھی کہ جو وہ سمجھتی تھی وہ میونس نہیں
سمجھتی تھی۔

”کیا کہا؟“ زل اس کی بات نہ سن سکی تھی۔
”تمہاری نظر میں ہے کوئی لڑکی ایسی جیسے مرنقی
بھائی بھی پسند کر لیں۔“

”ہوں۔“ اس نے لمحہ بھر سوچا۔

”میں نے نوٹ کیا ہے کہ مرنقی بھائی کا جھکاؤ
سمیرا کی طرف ہے۔ تم آج ذرا غور کرنا مرنقی بھائی
عموماً سمیرا کے قریب ہی بیٹھے ہیں اور ایک بار میں
مارکیٹ گئی تھی ساجدہ کے ساتھ تو میں نے دونوں کو
ایک شاپ سے ٹپکتے دیکھا تھا تب میرا خیال تھا کہ
تھیں اتفاق سے کہ دونوں ایک ہی جگہ شاپنگ کرنے

مجھے ہوں لیکن ہو سکتا ہے یہ اتفاق نہ ہو اور.....
 ”کون سیرا۔ وہ تو بیہوش کی دوست اگر ایسی بات
 ہوئی تو اماں تو بے حد خوش ہوں گی کہ جب سے شانزہ
 کی شادی ہوئی ہے وہ میرے لیے بھی شانزہ کے
 سسرال کی فکر کا سسرال ملنے کی حسرت میں مری جا
 رہی ہیں کہ میرے لیے بھی عقل بھائی جیسا کوئی اجیر
 کبیر بندہ ڈھونڈ لیں۔ تو میرے لیے نہ سبھی مرضی
 بھائی کے لیے ایسا سسرال مل جائے تو خوشی سے
 چھوٹے نہیں سما میں گی وہ۔ یہ کبیر لوگ تو جدی ہوتی
 رہیں ہیں۔“

”لیکن دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی محرش!
 بعض اوقات دولت کے ذریعہ پر بھی آدمی نا آسودہ
 رہتا ہے۔ دولت اسے خوشی اور سکون نہیں دے سکتی تم
 نے بھی شانے کو غور سے دیکھا ہے۔ وہ مجھے بھی خوش
 نہیں گئی۔ وہ جب بھی آتی ہے مجھے بے حد مضطرب
 اور بے چین کی لگتی ہے اور اس کی آنکھیں سخی سخی
 ہوتی ہیں۔“

”ہاں ایسا ہی ہے شانزہ شادی کے بعد بہت
 خاموش ہو گئی ہے۔ ورنہ پہلے تو ہم سب کے نہ نہ
 کرنے کے باوجود اپنے پڑھے مجھے ناولوں کی کہانی
 ضرور سناتی تھی۔ لیکن اب کہہ رہی تھی اس نے پڑھنا
 چھوڑ دیا ہے لیکن تم میری اماں کو نہیں جانتی ہو۔ وہ سخی
 مادیت پرست ہیں۔ دولت دیکھ کر تو وہ کسی مرانی سے
 بھی مجھے حیا ہے گویا تیار ہو جائیں۔ اس نے زل کی
 تائید کرتے ہوئے کہا تو زل مسکرائی۔
 ”تم اپنی ماں کو بھی نہیں بخشی ہو محرش!“

”ہاں تو غلط تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ پہلے وہ
 پھپھو پر رشک کرتی تھیں۔ یہ اتنی بڑی حویلی، اتنے
 نوکر چاکر، اتنے باغات، اتنی زمینیں اور اب ان کے
 رشک کا رخ شانزہ کی طرف مڑ گیا ہے اور یہ عقل
 بھائی بھی اس قدر شوخ کہ جب بھی آئیں گے اپنی
 دولت کی نمائش کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں
 دیں گے۔ مثلاً دینی گیا تھا شانزہ کے لیے ڈائننگ
 سیٹ لایا ہوں اور یہ لیکن مسودہ سے منگوائے ہیں میں

نے خالص چوبیس کمر کا سونا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور
 ان محترمہ کو شوق ہی نہیں ہے زیورات کا۔ زبردستی
 میری ممانے پہنا ہے ہیں اسے اور اماں کا بس نہیں
 چلتا کہ کنوؤں میں بالیں ڈالوا کر میرے لیے بھی کوئی
 ایسا ہی رشتہ ڈھونڈ لیں۔ مرضی بھائی اگر کبیر کے لیے
 سیر لیں ہوں تو مجھ پر سے تو اماں کی نظر کرم ہٹ
 جائے گی کم از کم، گو مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔ مرضی
 بھائی کی عادت ہے لڑکیوں سے فری ہونے کی۔“

بات کرتے کرتے اس کی نظر اور ابھی تو مرضی
 ٹیرس کے پاس کھڑا تھا اسے دیکھ کر چپچپ گیا تو اس نے
 برا سنا منہ بنایا اور زل کی طرف دیکھا جو پاؤں چپل
 سے باہر نکالے پتا نہیں جھک کر کیا دیکھ رہی تھی۔

”یہ تمہارے آئین صاحب کہاں ہیں۔ کب
 سے آئی ہوئی ہوں نیچے نظر نہیں آ رہے۔“

”ابا کو لے کر گئے ہیں ڈاکٹر ارسلان کی طرف
 ان کے پاس آج ماہر سے کوئی سائیکارٹسٹ آئے
 ہوئے ہیں غالباً امریکہ سے تو ڈاکٹر ارسلان نے زین
 سے کہا تھا وہ ابا کو لے آئیں ان سے بھی ایک مینٹنگ
 ہو جائے گی۔“ زل نے بتایا۔

”وہ بے چارے جان پہلے سے بہت بہتر لگتے
 ہیں۔“ محرش کی نظر میں ٹیرس کی طرف گھس لیکن
 مرضی سامنے نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں اللہ کا شکر ہے اب تیری سے امپرود کر رہے
 ہیں۔ شہو بابا کا بھی بہت ہاتھ ہے اس میں ابا کی ان
 سے بہت دوستی ہو گئی ہے پتا نہیں ابا اور وہ چپکے چپکے کیا
 باتیں کرتے رہتے ہیں۔“

زل کے لہجے میں شاہ زیب کے ذکر سے
 خود بخود ہی خوشگواریت آ گئی تھی اب وہ اکثر ماضی
 کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات کرنے لگے تھے ایک
 روز تو وہ کچن میں تھی کہ کچن کے دروازے پر آ
 کر اسے مریم کہہ کر بلا رہا تھا۔

”مریم! آج شام کو میرے کچھ مہمان آ رہے
 ہیں چائے پر کچھ اہتمام کر لیتا۔“
 اور اس کے مڑ کر دیکھنے سے پہلے ہی وہ تیز تیز

چلتے ہوئے واپس چلے گئے تھے۔ ایسے ہی کوئی نہ کوئی
 بات ہر دوسرے یا تیسرے روز ہو جاتی تھی۔

ایک روز وہ صبح جی جی کو سارے میں ڈھونڈتے
 پھر رہے تھے۔ بھی وہ ظفر یاب چچا کو تلاش کر رہے
 ہوتے۔ یہ ساری تبدیلیاں بہت خوش گوار تھیں۔ خوش
 آئندہ تھیں اب جب وہ ماضی میں سفر کرتے ہوئے
 زل کو اچھی نظروں سے دیکھتے تو وہ پہلے کی طرح
 ہرٹ نہیں ہوتی تھیں۔ جتنی بھی کہ وہ ہلے نادل ہو
 رہے ہیں۔ اب ان کی خوراک بھی پہلے سے بہتر ہو گئی
 تھی اور صحت بھی۔

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور اماں دائیں
 کندھے پر شولڈر بیگ لٹکائے اندر داخل ہوا۔ یقیناً وہ
 آج ہونے والی مینٹنگ میں شریک ہونے کے لیے
 آیا تھا۔ وہ مرسل کی تنظیم کے کام کو بہت پسند کرتا تھا
 اور ان کی کاوشوں کو بہت سراہتا تھا اور فنڈ میں بھی حصہ
 ڈالتا رہتا تھا۔

”یہ اماں کیلانی آ رہا ہے شایان نہیں ہے اس
 کے ساتھ۔“ شایان ہمیشہ اس کے ساتھ ہی آتا تھا۔
 ”وہ تو دو تین دن پہلے واپس گھر چلا گیا ہے
 تمہیں نہیں معلوم۔“ محرش کو حیرت ہو گئی تھی۔

”میرا خیال تھا وہ دادا جان سے ملنے آیا ہو گا۔
 کہہ رہا تھا یہاں دل نہیں لگ رہا بہت بوریٹ ہو رہی
 ہے۔“
 ”کیا پڑھائی چھوڑ کر چلا گیا ہے یا کچھ دنوں
 کے لیے گیا ہے؟“ زل نے پوچھا۔

”معلوم نہیں، مجھے تو اماں نے بتایا تھا۔ اسے
 بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ پھر آئے گا یا نہیں کہہ
 رہا تھا کہ اتنی ضد کر کے بمشکل جھوٹی امی کو راضی کیا تھا
 اس نے یہاں آ کر پڑھنے کے لیے۔ ورنہ اگر بچپن
 کے بعد اس نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر
 یکا یک ہی شوق پڑھا یہاں آ کر پڑھنے کا۔ موڈی
 ہے اب موڈ نہیں رہا ہو گا۔“

”محرش کی بیوہ رشی میں تقریباً روز ہی اماں سے
 ملاقات ہوئی تھی گوڈ پارٹمنٹ الگ الگ تھے۔

”ہاں پھپھو نے بھی بتایا تھا کہ شرہ آئی تو اسے
 بالکل یہاں آنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی لیکن
 اگوتا ہے تو بات سنوائی اپنی۔“ زل کو شایان کی بے
 یاکی ناگوار گزرتی تھی۔ وہ بے دھرمک اس کی تعریف
 کر دیتا تھا اور وہ پھپھو کی وجہ سے اس کا لحاظ کرتی
 تھی ورنہ اگر محرش کی طرح ہوتی تو پہلی بار ہی جب
 اس نے اس کی مہی کی تعریف کی بھی تو نوک دیتی۔
 ”السلام علیکم سسرز.....! اماں سیرھیوں کے
 پاس آ کر رکھ کا تھا۔“

”وہ علیکم السلام کیسے ہو؟“ زل نے فوراً ہی
 جواب دیا جب کہ محرش نے برا سنا منہ بنایا تھا۔

”سنو سسر اماں! مجھے اپنے نام کے ساتھ اس
 طرح کے لاطے ساجھے پسند نہیں ہیں۔ بھائی میرا
 ایک ہی ہے اور وہی رہے گا تم مجھے میرا نام لے کر بلا
 سکتے ہو۔“

”او کے میم!“ اماں نے ذرا سا سرخم کیا اور
 مسکرایا اور پھر مرز کرحن میں پڑی خالی کرسیوں کو
 دیکھا۔

”ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ میں ذرا نا نا جان سے
 مل لوں۔“ اس نے بیک ایک کندھے سے دوسرے
 کندھے پر منتقل کیا۔ اس میں اس کی کتابیں اور
 ٹائٹ ڈریس تھا۔ صبح جہاں زیب بیک سے فون پر
 اس کی بات ہوئی تھی تو انہوں نے اسے ادھر ہی رکنے
 کے لیے کہا تھا۔

”عموماً تو سب لوگ ان دنوں عمر کے فوراً بعد
 آ جاتے تھے لیکن آج ہو سکتا ہے کچھ لیٹ آنا ہو۔ زل
 نے سوچا۔“

آزین نے بتایا نہیں تھا اور ایسا ہی تھا آزین کو
 بتانا یا نہیں رہا تھا۔ وہ جب شاہ زیب بیک کو لے کر
 واپس آیا تو اس نے بتایا کہ اسے یاد نہیں رہا تھا بتانا کہ
 آج سب لیٹ آئیں گے۔ مرسل اور رضا تنظیم کے
 ہی کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ اس لیے مغرب کے
 بعد اکٹھا ہونے کا پروگرام بنایا تھا۔ شاہ زیب کو ان کے
 کمرے میں چھوڑ کر آزین جہاں زیب بیک کے

کمرے میں چلا گیا۔ امان کے ساتھ اس کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔

وہ اس سے مل کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ محرش پھر آنے کا کہہ کر اوپر چلی گئی تو وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھ رہی پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سب ہی اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔ محرش یونورٹی چلی گئی تھی۔ مہرین کا ہاؤس جاب اشارت ہو چکا تھا۔ جب کسی اس کی نائٹ ہوئی تو وہ وہاں ہی ہوٹل میں اپنی دوست کے پاس رہ جاتی تھی۔ ایک بس وہ ہی قادیان، روز لٹ کے بعد اس نے سوچا تھا کہیں جاب کر لے۔ کسی اسکول یا کالج میں، اسے دادا جان کی طرح پڑھانا پسند تھا لیکن دادا جان نے ایک بار کہا تھا کہ اگر اسے پیچنگ کرنی ہے تو بہتر ہے کہ ایم فل کر لے پھر کسی اچھے ادارے میں جاب مل جائے گی ورنہ سبیل ماسٹر کر کے تو کسی برا یونیورسٹی کا کالج یا اسکول میں چند ہزار تنخواہ ہی ملے گی لیکن اس کا ایم فل یا ڈاکٹریٹ کر کے جاب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آئین کو بلا وجہ خواتین کا جاب کرنا پسند نہیں تھا۔

ایک بار اس نے نہ جانے کس بات پر کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میں آفس سے تھکا ہارا گھر آؤں تو میری بیوی فریش اور تروتازہ ہی میرا استقبال کرے اور اسے دیکھ کر میرے دن بھر کی محنت دور ہو جائے نہ کہ اپنی جاب سے تھک کر آئی ہوئی اس لیے اس نے سوچا تھا کہ وہ جاب نہ کرے گی۔ لیکن اب گزرنی گریوں کی جتنی دوپہروں میں وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر بھی تھک چکی تھی۔

کتابیں پڑھتا، بی بی اماں سے باتیں کرتا، ساجدہ سے کام کر داتا اور بس سارا دن قادیان، آج کل اوپر بھی وہ کم ہی جاتی تھی ہاں اگر شانزہ اور عقیل نے آنا ہوتا تو رخسانہ تا اسے بلواتی تھیں ورنہ آج کل انہیں ایک فل ٹائم ملازمہ مل گئی تھی جو بچوں کے کام دیکھ لیتی تھی۔ باقی کا کام تو وہی ساجدہ کی بھائی ہی کر رہی تھیں۔ اور ایسے بوریت بھرے دنوں میں اسے

وجدان احمد کا مشورہ اچھا لگتا تھا۔

دس پندرہ دن پہلے وجدان احمد میرا کے ساتھ آیا تھا اسے آئین سے کوئی کام تھا۔ آئین اس روز کچھ لیٹ ہو گیا تھا سو اس کا انتظار کرتے اور چائے پیتے ہوئے اس نے اس کا ارادہ پوچھا تھا کہ وہ اب پڑھائی کے بعد کیا کرنے کا سوچ رہی ہے۔ مزید پڑھنا یا جاب وغیرہ کرنے کا ارادہ ہے۔

مزید پڑھنے کا۔

اس نے سسٹم کی پلٹ سمیرا کی طرف بڑھائی تھی جو خاموش بیٹھی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”تو آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ کچھ وقت ٹائپنگ بچوں کو دے دیں۔ یہ چند قدم کی دوری پر تو اسکول ہے ان کا۔ رضا کا راندہ طور پر یا کچھ سکری لیتا چاہیں گی تو وہ بھی مل جائے گی۔“

وجدان احمد خود اس اسکول میں رضا کا راندہ طور پر کام کرتا تھا اور اسکول کو کافی ڈیوٹن بھی دیتا تھا۔

”لیکن مجھے تو ٹائپنگ بچوں کو پڑھانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“ وہ خود بھی کچھ کرتا چاہتی تھی کوئی مثبت کام۔ ایسا کام جس سے دل کو سکون ملے۔

”وہ تو کچھ مشکل نہیں ہے اسکول کے ساتھ ہی اکیڈمی ہے جہاں بریل وغیرہ کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ اگر آپ اکیڈمی نہ جانا چاہیں تو اسکول میں بھی انتظام ہے۔“

اس نے بتایا تھا لیکن وہ ابھی تک جہاں زیب بیک سے بات نہیں کر سکی تھی۔ خیر آج بات کروں گی اگر دادا جان نے اجازت دے دی تو پھر آئین سے بھی پوچھ لوں گی۔ ہاں نہیں اسے اچھا لگے گا یا نہیں۔ وہ آج کل بہت پوزیٹو ہو رہا تھا یا ہمیشہ سے ایسا ہی تھا لیکن اس نے اب غور کیا تھا کہ وہ شایان یا سرنقی سے بھی بات کرنی تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ اگر آئین کو برا لگا تو وہ پھر گھر میں ہی کچھ نہ کچھ کر لے گی۔ کیا کرے گی۔ یہ ابھی اس نے سوچا نہیں تھا۔

وہ ابھی تاکہ کوئی کتاب ہی دیکھ لے مغرب تک۔ رات ہی وہ دادا جان سے دو نئی کتابیں لے کر آئی تھی۔ جب ہی دروازہ کھول کر بی بی اماں نے اندر بھاٹکا۔

”میں نے کہا دیکھ لوں سو تو نہیں گئی ہو۔ اذان بس ہونے ہی والی ہے۔ تم نماز پڑھ کر ذرا چٹن میں چلی جانا۔ میں نے آج دھیمی کر دی ہے ذرا سی کسر کھی گوشت گھٹے میں۔ ویسے تو ارادہ تھا صبح ہی نہاری تیار کروں گی لیکن امان اور آئین کو چائے دینے کی تو آئین نے بتایا کہ آج سب نے دیر سے آنا ہے تو میں نے سوچا پھر سب کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ ویسے بھی وہ تمہاری سمیرا بی بی کہہ رہی تھی اس روز کہ بہت دن ہو گئے آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا کچھ نہیں کھایا۔ نان بازار سے آجائیں گے۔ چھ سات بندے ہی قائل ہوں گے۔“

وہ مغرب کے بعد نفل وغیرہ پڑھتی تھیں اس لیے زل سے کہا تھا کہ وہ کچن میں چلی جائے۔

”جی بی بی اماں دیکھ لوں گی آپ فگر نہ کریں۔“

زل نے کہا تو بی بی اماں نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے گوشت اچھا مل گیا تو چلو ہینڈ کر دینا۔ باقی میں پھر خود تیار کر لوں گی اور ہاں کاؤنٹر پر کھیر کے باؤل رکھے ہیں۔ ٹھنڈے ہو گئے ہوں تو فریج میں رکھ دینا۔ آخر بتاتی تھی کہ اس کے بچوں کو بادام والی کھیر بہت پسند ہے تو امان نے آنا تھا تو میں نے بتادی۔ کافی دودھ پڑا تھا۔ زیادہ ہی بتادی۔“

وہ دروازے سے ہی واپس چلی گئیں۔ اذان شروع ہو گئی تھی۔ وہ نماز پڑھ کر کچن میں آئی گوشت تقریباً گل ہی چکا تھا۔ بی بی اماں نہاری اور پائے نگر میں نہیں کھاتی تھیں بلکہ دھیمی آج پر رکھ دیتی تھیں۔ سارا دن دھیمی آج پر گھٹے رہتے تھے۔ وہ کچھ دیر کچن میں ہی بیٹھی رہی۔ جب اسے لگا کہ اب گوشت بالکل گل چکا ہے تو چلو ہینڈ کر کے باہر آئی۔ بی بی اماں مغرب کے وقت ایک لائٹ جلا دیتی تھیں اس نے باقی کی دو لائٹیں بھی جلا دیں جس سے پورے کچن

میں بھی روشنی پھیل گئی تھی۔ لائٹ جلا کر وہ تخت پر بیٹھی بی گئی کہ کچن کا دروازہ کھلا۔ وجدان احمد درمیرا ساتھ ساتھ اندر داخل ہوئے۔

”السلام علیکم!“ وہ برآمدے میں ہی چلے آئے تھے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ سلام کرنے اور خیریت پوچھنے میں وجدان احمد نے ہی پہل کی تھی جب کہ میرا بیٹھے کسی سوچ میں کم تھی آج اس نے شلوار میں پین رچی تھی اور بڑا سادہ پٹا بھی اوڑھا ہوا تھا جس کا ایک کوننا زمین کو چھو رہا تھا۔ آج بی بی اماں اسے دیکھ کر یقیناً خوش ہونے والی تھیں۔

”اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹھیں پلیز امان اور آئین دادا جان کے کمرے میں ہیں۔ آتے ہوں گے۔“

اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وجدان نے زمین پر ٹکٹا ہوا سمیرا کے دوپٹے کا کوننا اٹھا کر اس کے کندھے پر ڈالا۔

”یار کیا اب میں ساری زندگی تمہارا دوپٹا ہی اٹھاتا رہوں گا بہتر ہے کہ تم بقول بی بی اماں کے وہ دو اونچے چوڑا منظر ہی گلے میں لٹکایا کرو۔“

زل کے لیوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ سمیرا نے اسے بتایا تھا کہ وہ اور وجدان احمد دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں میری بہن کی شادی کا مسئلہ حل ہو گیا تو پھر وہ مجھے پروپوز کرے گا۔

”لوگ تو نہ جانے کیا کیا کچھ نہیں کرتے اپنی بیویوں کے لیے تم اتنا سا کام نہیں کر سکتے۔“ سمیرا کرسی کو تخت کے قریب کھینچتے ہوئے بیٹھ گئی تھی۔

”اب اپنے والد محترم کو ہی دیکھ لو۔ کیسے ہاتھ باندھے حکم کی تعمیل کے لیے کھڑے رہتے ہیں آنٹی کے سامنے۔“

”جو حکم سرکار کا۔ ہم بھی غلاموں کی طرح آپ کا دوپٹا اٹھائے آپ کے پیچھے پیچھے چلتے رہیں گے ساری عمر۔“

ذرا سا سر کوخم کرتا ہوا وہ بھی اس کے قریب ہی

دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ زبل نے اٹھ کر پٹکھا آن کیا۔
”میں آ زین کو بتاتی ہوں آپ کے آنے کا۔“
”رہنے دو یا ر! آجائے گا۔ خود ہی۔ ابھی آنے سے پہلے تو بات ہوئی تھی آ زین کی وجدان سے۔
وجدان نے بتایا تھا اسے کہ ہم گھر سے نکل رہے ہیں۔“

سیرانے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
”اتنے سارے دن ہو گئے ہیں پھر آرام سے بیٹھ کر تم سے بات ہی نہیں ہو سکی۔ کہا بھی تھا تم سے کسی روز میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ پورا دن میرے ساتھ اسپتال کرو۔ میرے گھر مانا اور میری بہن کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ بتایا تھا تمہیں بھائی اور زید تو باہر ہوتے ہیں۔“

”اُنکی کوئی بات نہیں سیرا! میں اس طرح اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتی آ زین سے کہوں گی کسی روز ایک دو گھنٹے کے لیے تمہارے گھر چھوڑ جائے گا مجھے۔ اور پھر لے بھی جائے گا۔“

وہ سیرا کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ بی بی اماں کہتی تھیں ”بڑے لوگوں سے دوستی رکھنے کے لیے اپنے گھر کے دروازے بھی بڑے بنوانے پڑتے ہیں۔ ہم متوسط طبقے کے ہیں اتنے امیر کبیر لوگوں سے دوستی نہیں نبھایاؤ گی تم۔“ لیکن سیرانے اتنی بار اصرار کیا تھا کہ آج وہ انکار نہیں کر سکتی تھی اور اس نے تھوڑی دیر کے لیے اس کے گھر جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔

”ارے آ زین کیوں۔ میں خود ہی آ کر تمہیں لے بھی جاؤں گی اور واپس بھی پہنچا دوں گی۔“ سیرا خوش ہوئی تھی۔

”جانتا ہے میں نے گھر میں تمہاری اتنی تعریفیں کی ہیں کہ میری ماما اور بہن روز کہتی ہیں کہ کسی روز اپنی فریڈ کو گھر لے کر آؤ۔“

”تو تم لے آتیں تاکہ کسی روز اسے ساتھ انہیں ہمارے گھر۔ میرا تو یوں بھی گھر سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا پہلے یوں جانی تھی بس اور اب تو سارا وقت گھر

پر ہی ہوتی ہوں۔ مقصد تو ملاقات ہی ہے نا۔“
”نہیں یا ر! تم میری منہ کو نہیں جانتیں۔ وہ کم ہی کسی کے گھر جاتی ہیں۔ ان کا اپنا ایک حلقہ احباب ہے بس وہاں ہی ان کا آنا جانا رہتا ہے۔“ سیرا مسکرائی۔

”بس تم جلدی کرو گرام بنا کر مجھے بتاؤ۔“
”خود کو اس حوالی تک محدود نہ کریں مس زبل۔ باہر نکلیں گی تو سوچ اور فکر میں وسعت پیدا ہوگی۔ لوگوں سے ملے جلسے کی تو لوگوں کو پہچاننے کی صلاحیت بھی بڑھے گی۔ لوگ بڑے منافی ہوتے ہیں۔ چہروں پر اچھائی کا نقاب چڑھائے اندر سے کچھ باہر سے کچھ۔ کہیں دھوکا کھائیں گی کسی کو سمجھنے میں تو کہیں پھر کچھ میں بھی آجائے گی لوگوں کی۔“
وجدان احمد نے پر خلوص مشورہ دیا۔

”اسی لیے آپ کو اس تاجینا بچوں کے اسکول کے لیے کام کرنے کو کہا۔“

”میں نے ابھی دادا جان سے بات نہیں کی اگر انہوں نے اجازت دے دی تو۔“ اس کی نظر سامنے پڑھیں پر سے اترتے مرتضیٰ پر پڑی تو وہ کھڑی ہو گئی۔

”وہ مرتضیٰ بھائی آرہے ہیں۔ وہ آپ کو کہنی دیتے ہیں۔ میں ذرا ابابا کو دیکھ آؤں۔ کیا کر رہے ہیں۔ آج آ زین انہیں ڈاکٹر ارسلان کی طرف لے کر گیا تھا۔“

اسے یکدم ہی شاہ زیب کا خیال آیا تھا۔ اور پھر مرتضیٰ کے آنے سے پہلے ہی وہ شاہ زیب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”کیا یہ تم مجھے سنارہے تھے وجدان۔“ سیرا مود خراب ہو گیا تھا۔

”سیرا خاص تمہاری طرف اشارہ نہیں تھا۔ میں نے ایک عام بات کی تھی۔“

وجدان احمد نے بغور اس کے بگڑے تیور دیکھے تھے۔ سیرانے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن پھر مرتضیٰ کو قریب آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ مرتضیٰ

نے بہت خوش دلی کے ساتھ سلام کیا اور تخت پر سیرا کے مقابل بیٹھ گیا۔
”اور سنائیں سیرا جی اور وجدان احمد کیا چل رہا ہے آج کل۔“

”کچھ خاص نہیں وہی پرانی روٹین ہے۔“
سیرانے بی بی اماں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سر پر بڑے ڈھلک جانے والے دوپٹے کو درست کیا۔ وہ بی بی اماں کی گڈ بیک میں آنے کی ان دنوں پوری کوشش کر رہی تھی۔ وجدان احمد ہمیشہ کی طرح بی بی اماں کے قریب آنے پر اعتراض نہ کرتے ہوئے تھے اور ان کی تقلید میں سیرا بھی کھڑی ہوئی تھی۔

”جیسے رہو۔۔۔۔۔ سلام کا جواب دے کر بی بی اماں نے ساسی نظروں سے سیرا کو دیکھا۔

”تم لوگ آج ادھر برآمدے میں ہی بیٹھو گے یا محن میں آ زین سے کہہ کر پینڈل رکھو ادوں۔“

”محن میں بی بی اماں اتنی اچھی ہوا ہے۔ مجھے کھلی فضاؤں میں بیٹھنا پسند ہے۔ جواب سیرانے دیا تھا جس کی تائید مرتضیٰ اور وجدان احمد نے بھی کی تھی ”ٹھیک ہے۔ میں آ زین سے کہتی ہوں۔ وہ اسٹور سے چٹھا کال کر محن میں رکھ دے۔“

”ابھی تو خیر کوئی ضرورت نہیں ہے۔“
سیرانے سامنے ہواسے جھومتے درختوں کے پتوں کو دیکھا۔

”سورج ڈوبنے کے بعد دیے ہی تھوڑی خشکی ہو جاتی ہے آج کل۔۔۔۔۔ لیکن احتیاطاً نکلوا ہی دیجیے گا۔“

بی بی اماں اشارہ میں سر ہلاتے ہوئے جہاں زیب بیک کے کمرے کی طرف جانے لگیں لیکن پھر جاتے جاتے پلٹ آئیں۔

”پہلے ذرا شاہ زیب کو دیکھ آؤں جب سے واپس آئے ہیں دیکھا ہی نہیں۔“

سب بہن بھائیوں میں سے انہیں شاہ زیب سے زیادہ محبت تھی ”زل بھی ادھر ہی ہے۔“

سیرانے بی بی اماں کو بتایا اور مرتضیٰ کی طرف

متوجہ ہو گئی۔ بی بی اماں نے شاہ زیب کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے ہی بیڈ کے پاس زبل کرسی پر بیٹھی شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی اور شاہ زیب سو رہے تھے۔
”سو رہے ہیں۔“ بی بی اماں نے دروازے میں کھڑے کھڑے ہی پوچھا تھا۔

”جی میں آئی تو سو رہے تھے۔“ زبل نے ان کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک گیا ہو گا۔ تین چار گھنٹے تو لگ گئے وہاں۔ لیکن اچھا ہوا اب ہر کے ڈاکٹروں نے بھی دیکھ لیا۔ زین بتا رہا تھا کہ بہت کئی دی ہے انہوں نے۔ دوا کی خوراک مزید کم کر دی ہے۔ ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ وقت پر ہمیں کچھ میں آجانی تو بروقت علاج ہو جاتا۔ ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ مریم کے غم میں چپ سا دھ لی ہے خیر جو میرے اللہ کو منظور ہو۔“

وہ واپس چلی گئیں لیکن زبل پھر مڑ کر شاہ زیب کو دیکھنے لگی تھی اس کا ابھی باہر جانے کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔ اباب بھی کتنے شاندار اور خوب صورت ہیں۔ اور وہ دن کتنا خوب صورت ہو گا جب بابا لکل پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائیں گے۔ تب میں ان سے بہت ساری باتیں کروں گی۔

وہ ساری باتیں جو گزشتہ سالوں میں مجھے ان سے کرنی تھیں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنے چھوٹے چھوٹے غم سب شیئر کروں گی ان سے۔ اماں کے بعد اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ ان سے اماں کی باتیں کرے وہ ساری باتیں انہیں بتائے جو اماں نے اپنے آخری دنوں میں اس سے کی تھیں۔ وہ ان کے چہرے پر نگہ ہیں جمائے سوچوں میں گم تھی کہ باہر ہلکا سا شور سنا دیا۔ اس شور میں ثوبہ کی آواز واضح تھی۔

یعنی سب آ گئے تھے۔ اس نے چونک کر شاہ زیب کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو اسے کمرہ کچھ بے ترتیب سا لگا۔ روم چیر زلٹھا کر اپنی جگہ پر تھیں۔ کافی ٹیبل پر موجود نامعلوم سی گرد کو صاف کیا اور ٹیلیف پر پڑی

کتابوں کو بلا وجہ ہی آگے پیچھے کیا۔ پھر وارڈ روب کھولا تو وہاں واقعی بے ترتیبی سی تھی۔

ساجدہ نے دھلے ہوئے کپڑے یوں ہی بے
ڈھنگے طریقے سے تہ کر کے رکھ دیے تھے۔ ابھی یہ
سب استری ہوئے تھے۔ کئی دنوں سے اس نے اس
طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے بنیائیں موزے الگ
کیے کپڑوں کو صحیح طرح سے تہ کیا۔ دو تین جوڑے جو
ساجدہ نے ہنگ کر دیے تھے انہیں چیک کیا کہ صحیح
استری کیے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ایسا کتنے نفاس پسند
تھے۔ کپڑوں پر ایک ممکن مجسمہ رہ جاتی تو ناراض ہوتے
تھے۔ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا وہ اب بھی سو رہے
تھے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی وارڈ روب سے ٹیک لگا کر
کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

کیا اس کے ذہن میں کوئی الجھن تھی۔ کچھ تاجروں سے ڈسٹر ب کر رہا تھا لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سر کو ہولے سے جھٹک کر وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آئی۔ آئین نے پیڈل فین لگا دیا تھا۔ پرائے کی اضافی لائیٹ بھی جل رہی تھی اور وہ سب صحن کے درمیان میں گول دائرے کی شکل میں کرسیاں رکھے بیٹھے تھے۔ مرسل، عمر، وجدان، مرتضیٰ، امان اور آئین۔ اس نے ایک نظر ان پر ڈال کر پھر سامنے میز میوں کی طرف دیکھا۔ دوسرے بوڑھے پر سمیر اور ٹوبہ بھی تھیں۔ ٹوبہ نے اسے دیکھ کر ہاتھ پٹایا لیکن وہ اوپر سے آئی شانزہ اور حشر کو دیکھ رہی تھی۔

”شانے! تم کب آئیں۔“
وہ تیزی سے محن عبور کر کے سڑکیوں کے
قریب آئی تھیں۔ اس کی آواز سن کر عراغیانے مڑ کر
پچھے دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی رخ موڑ لیا تھا ”کچھ دیر
پہلے غسل چھوڑ کر گئے ہیں۔“
وہ وہاں ہی بیٹھ کر مٹی۔

”بہت دنوں بعد چکر لگایا تم نے۔ پتا نہیں کیوں اتنا یاد آ رہی تھیں تم۔“ زل کو اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔

”ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔“ ثوبیہ نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”سوری اتنے دنوں بعد شانزہ کو دیکھا تو۔“
اس نے بات ادھوری چھوڑ کر معذرت طلب
نظروں سے ٹوپیہ کو دیکھا تب ہی وجدان احمد نے میرا
کو آواز دی۔

”ادھر تو آنا یا ر!“ میرا کہ ساتھ ٹوپیہ بھی اٹھ گئی تھی حشر جو ابھی تک کھڑی تھی اس نے اپنی ناک کیڑی۔
”لگتا ہے بی بی اماں کچھ خاص پکا رہی ہیں۔ دیکھوں تو۔“

اس سے پہلے کہ زل اسے کچھ بتاتی وہ تیزی سے میز پر ہاتھ اتر کر کچن کی طرف چلی گئی تو وہ شانزہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر پوچھا۔
”کسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“
 ”خوش ہونا..... عقل بھائی تو تمہارے ساتھ
 ٹھیک ہیں نا۔ حشر کہتی ہے وہ بہت کھڑوس سے
 ہیں۔“ شانزہ کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔
 ”تم ہر بار مجھ سے یہ کیوں پوچھتی ہو کہ تم خوش
 ہو یا نہیں۔“ شانزہ نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے
 دیکھا۔

”پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے تم مجھ کو نہیں
 ہو۔ جیسے تائی جان نے تمہاری زندگی کا فیصلہ کرنے
 میں کہیں کوئی غلطی کر دی ہو۔“ زبل نے بغور اسے
 دیکھا۔

”جسمیں ایسا کیوں لگتا ہے زل۔ میں خوش ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔“ اس کے لیوں پر پھسکا کا مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

”بس میرا دل کہتا ہے۔“ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

تہارادول میرے متعلق کچھ کہتا ہے جب کہ میری
دل کا دل تو انہیں میرے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔“
اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ زل کا دل
ملازم ہو اس نے شانزہ کے ہاتھ کو دیا۔
”دوستی اور بے شک نہیں تھی لیکن خون
کا رشتہ تو بے ناشانے۔ تو شاید اسی لیے میرا دل
تہارے متعلق سوچ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ شادی
کے بعد تم وہ پہلے والی شانزہ نہیں رہی ہو۔ وہ جو
میں اور رسالے پڑھتے ہوئے خود بخود مسکرائی اور
خود بخود ہی افسردہ ہو جاتی تھی۔ تمہاری آنکھوں کی وہ
کالائی شانزہ ہے۔“

”خون کا رشتہ..... وہ تو اور بھی لوگوں سے تم سے زیادہ گہرا ہے۔ دراصل تم بہت حساس ہو۔ مجھے لگتا تھا کہ جب تم اوپر آئی تھیں تو مجھے اتنے غور سے دیکھتی تھیں۔ مجھے کتاہوں کی دنیا میں رہنا اچھا لگتا ازل! کہانیوں کے کرداروں کے ساتھ جینا ان کی شیوں پر خوش ہونا اور ان کے دکھوں پر افسردہ ہونا.....“

اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر گود رکھا۔

”کہانی اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔
کہانیوں کی دنیا سے نکل کر اپنی حقیقت کی دنیا میں
اے بی بی! تو کچھ تبدیلی تو آنی تھی نا۔“
”کیا بات کہوں شانزہ۔“ زبل نے اس کے
دہرہ ہاتھ رکھا۔

”اگر مجھے نہیں لگے کہ تمہیں کسی کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مجھ سے کہنا۔ میں کوئی مہذبہ بھی کر سکتی ہوں۔ اور اگر مشورہ بھی نہ دے سکیں تو مجھ سے شیئر کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہیں۔ وہ سب جو تم تباہ جیل رہی ہو اور کسی سے کچھ کہنا

”او کے اگر کبھی مجھے ضرورت پڑی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی تو تم سے ہی کہوں گی۔“
وہ پھر سامنے دیکھنے لگی تھی۔ گو وہاں بہت زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن پھر بھی کپٹی کے پاس ہلکا سا نسل زل کو نظر آ گیا تھا۔
”ہے..... یہ کیا ہوا شانزدہ؟“ زل نے انگلی اس کے نسل پر رکھی۔

”آپ نے جیوں سے پاؤں پھسل گیا تھا تو معمولی سی جوت لگی تھی۔ ویسے حیرت ہے۔ ہمیں اندھیرے میں یہ نسل نظر آ گیا جب کہ اوپر تیز روشنیوں میں سیری اماں کو نظر نہیں آیا۔“

وہ ہولے سے ہسی..... ایسی ہی جس میں زل کو
 نوٹے کا بیج کی چھین محسوس ہوئی تھی۔ لیکن وہ خاموشی
 سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ بنا کچھ کہے۔ کچھ تو تھا جو
 شانزدہ چھپا رہی تھی۔

”باقی سب تو ٹھیک ہے ڈپٹی سیر کی جیٹا جائے گی۔ دو انیس بھی آجائیں گی۔ وجدان اور میں سارا خرچ اٹھائیں گے لیکن ڈاکٹر کہاں سے آئے گا؟“

سیرا کی بلند آواز پر وہ چونک کر سامنے دیکھنے لگی۔

پھر اوجھان احمد کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے
کھڑی تھی جبکہ ٹوپہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔
”رضا کا بھائی ہے۔ ابھی پچھلے سال غی اس
نے ہاؤس جاب مل گیا ہے۔ ایک پرائیویٹ ہسپتال
میں حال ہی میں جاب کی ہے۔ اس نے بچے میں
ایک دن جانے کا کہا ہے وہاں۔“
مرسل نے بتایا۔

”اور باقی کے دن کے لیے کیا ہوگا۔ ڈپٹی سہری
بندر ہے گی کیا۔“ وجدان احمد نے پوچھا تھا۔
”نہیں ہمارے گھر کے پاس ایک ڈاکٹر صاحب کام
کرتے تھے۔ دوائیاں دینا، ککشن لگانا وغیرہ ہم سب
نہیں کیا، ڈاکٹر صاحب کہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب
تقریباً سال بھر پہلے کلینک بند کر کے کہیں باہر چلے

مگر تھے تو تب سے یہ قرار ہی ہیں۔ محلے میں کسی کی انجکشن لگانا ہو۔ ڈرپ لگی ہو یا کوئی اور چھوٹی موٹی تکلیف ہو تو یہ کیا ڈنڈر صاحب ہی کام آتے ہیں۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ اکیلے آ دی ہیں۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اولاد کوئی ہے نہیں۔ وہاں ڈنڈری کے ساتھ ہی رہاں کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تنخواہ فنڈ میں سے دے دیں گے اس طرح ڈنڈری پورا ہفتہ کھلی رہے گی۔ چھوٹی موٹی بیماری زکام بخار وغیرہ کی دوا تو دے ہی دیں گے۔ بیس پچیس سال کام کیا ہے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ۔ بہت تجربہ کار ہیں۔“

مرسل نے تفصیل بتائی۔
”گاؤں والوں کا تو کام ہو جائے گا لیکن ہم لوگوں کا نقصان ہو جائے گا۔ وقت بے وقت آدھی رات کو بھی ضرورت پڑتی تھی تو بلالیتے تھے۔“ مرنقی نے بے اختیار کہا تھا۔

”کتے خود غرض ہوتے۔“ میرا نے مرنقی سے کہا تو وجدان ہنسا۔

”یہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہے خود غرض ساتھیوں آج پتا چلا۔“ وجدان احمد یونیورسٹی کے زمانے سے اسے جانتا تھا۔ اس سے پہلے مرنقی کچھ کہتا، لیکن سے بی بی امال اور حشر با۔ بی بی امال کے ساتھ میں سمجھتا تھا بھرا ہوا جگ تھا جب کہ حشر کے ہاتھ میں گھاسوں والا ٹرے تھا۔ انہوں نے ان سب کے درمیان پڑی گول میز پر آ کر رکھے۔

”تھنک یو بی بی امال میرا پسندیدہ مشروب۔“ مرسل نے میز پر پڑی فائل اٹھائی۔

”چائے کا تم نے منع کر دیا تو میں نے کہا لمبوں پڑے ہیں یہ ہی بتالوں۔“ تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور مہرین دامن کندھے پر شولڈر بیگ لٹکائے کھکی کھکی سی داخل ہوئی۔

”مہرین آگئی۔“ حشر گھاسوں میں مشروب ڈال رہی تھی اس نے اشارے سے مہرین کو ادھر ہی آنے کا کہا تھا۔

مہرین نے سب کو مشترک سلام کیا تھا اور سیرھیوں کی طرف بڑھتے ہی گلی کی کھیرا کی بات سن کر رک گئی۔ ”باتی مسئلے تو حل ہو گئے لیکن عورتوں کا زیادہ مسئلہ ہے وہاں ہم نے سروے کے دوران دیکھا تھا۔ عورتیں بیمار ہوتی ہیں تو کس گھر میں ہی علاج کر لیا جاتا ہے کسی حکیم سیانے سے پوچھ کر۔ مرد تو پھر شہر جا کر ڈاکٹر کو دکھالیتے ہیں۔“

”ایک خاتون ڈاکٹر کا انتقام ہو جائے تو سمجھو پھر اس گاؤں کا علاج مجالے کا مسئلہ تو حل ہو ہی جائے گا۔“

”کیا بات ہے؟“ مہرین نے سوالیہ نظروں سے کھیرا کی طرف دیکھا تو اس نے تفصیل بتائی۔

”تو میں ہر سٹنڈے کو چلی جایا کروں گی۔“ مہرین نے فوراً کہا۔

”اتنی تھکی ہوئی ہوتی ہو تم ذیونیاں بھٹکتا بھٹکتا ایک ہی دن ہوتا ہے آرام کا۔“

حشر کو بھی مہرین کا خیال رہتا تھا۔

”بھنے کو اگر ٹائٹ وغیرہ لگی تو کسی کے ساتھ ذیونی چیخ کر لوں گی۔“ مہرین جیسے فیصلہ کر چکی تھی۔

”وہ تو تھک ہے لیکن یہاں سے اس گاؤں تک بڑھ کھنکے کا قاصلہ ہے۔ آتا جاتا آسان نہیں ہوگا لوکل بس یا سوزو کی پراسیکلے سٹر کرتا۔“ آرتین پریشان سا لے دیکھ رہا تھا۔

یہ ذمہ داری میری..... میرا اور میرا ڈرائیور حاضر۔ یہ مریض دیکھے کی اور میں وہاں کی عورتوں کے مسئلے مسائل جان کر اپنے کالم کا بیٹ بھروں گی۔

وہ کسی اخبار میں کالم لکھتی تھی۔ اس نے اور وجدان احمد نے جرمزم میں ماسٹر کیا تھا۔

”اور وہ بات کیا ڈنڈر صاحب والی تو درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔“

عمر اعجاز نے حشر کے ہاتھ سے گھاس لیا۔

”ان کی تنخواہ جو بھی مقرر کی آپ نے میں ادا کروں گا۔ فنڈ کو دوسرے کاموں کے لیے ہی مختص رہنے دیں۔“ بی بی امال واپس چن کی طرف جاتے

جائے مڑی تھیں۔
”تین بیٹا! شیخو آئے تو نان منگوا لیتا..... اور ہاں بچوں! میں نے نہاری بنائی ہے آج تم کھاؤ کھا کر مری جانا۔“

”واؤ..... اتنے دن ہو گئے تھے آپ کے ہاتھ کا کچھ کھائے ہوئے۔ جس بی بی امال! ہزاروں سال۔“

سیرا خوش ہوئی تھی اور زل کو ایک دم یاد آیا کہ بی بی امال نے کہا تھا کہ اپنے ابا کو چکا کر پہلے کھانا دے دینا پھر دوا کھانی ہوئی ہے انہوں نے۔

”ننھی میں نے ان کے لیے بنادی تھی پتا نہیں نہاری کھا میں گے یا نہیں۔ روٹی تم بتا لیتا۔“

”میں ابھی ابا کو کھانا دے کر آتی ہوں شانزہ۔“ وہ تیزی سے دو تین سیرھیاں اتر کر کچن کی طرف چلی گئی۔ بی بی امال تو اچھلے پر کھ رہی تھیں۔

”میں بتا چکی ہوں بی بی امال آپ نہیں شانزہ کے پاس بیٹھ گئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا اتنے دنوں بعد وہ آئی ہے۔ تھک تو ہے۔“

”جی۔“

”تم یہ اذکر ہرا دھیا اور ہری مرچیں وغیرہ کاٹ دو۔“

انہوں نے کچن ٹیبل پر پڑی ہنری کی نوکری کی طرف اشارہ کیا۔ ”اتنے میں روٹی بنی جاتی ہے۔ ایک پھلکا ہی تو بناتا ہے۔“ وہ روٹی بناتے لگی تھیں۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے نوکری میں سے اذکر کا کٹوا اٹھایا۔

”لمبوں فریج میں ہیں۔ اس وقت نکال لیتا۔“

آنا ڈالنے سے پہلے میں نے تری (مٹی) نکال کر یہ ادھر باؤل میں رکھ دیا ہے۔ شیخو نان لے آیا تو میں اگر عشاء پڑھ رہی ہوں تو حشر کے ساتھ مل کر کھانا لگا دیتا۔ نان ٹھنڈے ہو جائیں گے۔“

انہوں نے روٹی تو بے سے اتار کر دسترخوان میں لپٹی اور بڑے تیار کرنے لگیں۔

”یہ اب تم لے جاؤ شاہ زیب کی طرف سو رہے ہوں تو جگا لیتا۔ دوپہر کو کھئی دو نوالے کھائے تھے۔“

زل اٹھی اور کاؤنٹر پر سے ٹرے اٹھا کر مڑی سی تھی کہ آرتین خالی جگ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ زل کی نظریں اس کی نظروں سے ملیں۔ سپاٹ سر دمہری نظریں۔ وہ کتنا بھی خاموش اور اپنے آپ میں کم ہوتا اس کی نظروں میں اتنی پتھری کی سرد مہری اور

اجنبیت نہیں ہوتی تھی بقول بی بی امال کے وہ خود سے ہی خفا ہو جاتا تھا۔ لیکن زل کو تب بھی اس کی نظریں جذبے لانی محسوس ہوتی تھیں۔ تو کیا وہ نامعلوم سی

ابجھن اور پریشانی جسے وہ سمجھ نہیں پاری تھی اس لیے تھی کہ ایک دو دن سے آرتین کی نظروں میں اس کے لیے سرد مہری درآئی تھی۔

وہ ٹرے ہاتھ میں لیے ساکت کھڑی تھی وہ جگ کاؤنٹر پر رکھ کر اس کے قریب سے گزرتا ہوا باہر نکل گیا۔ کیا آرتین ہمیشہ اسے صبحی چچی کے تناظر میں دیکھے گا۔ کیا وہ اس کی نظریں کبھی متبر نہ ہو پائے گی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا زل؟“ بی بی امال اسے یوں جینتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

”وہ چکر آ گیا ہے بی بی امال!“ آنکھوں میں نمی پھیلی جا رہی تھی جسے چھپانے کے لیے اس نے سر ٹیبل پر رکھ دیا۔

”چکر تو آئیں گے نا، بتاؤ بھلا صبح سے کیا کھایا پیاتے تم نے۔ ناشتے میں خالی خولی جائے کے دو کوک اور آدھا سلاک اور دوپہر میں کھئی دو نوالے لے کر کھ کھڑی ہوئیں کہ بھوک نہیں ہے۔ نہ تم اپنا خیال رکھ رہی ہو اور نہ زین، نہ یہ تم دونوں نے آج کل ڈانٹنگ شروع کر رکھی ہے کیا؟“

بی بی امال نے بڑبڑاتے ہوئے فریج میں سے پکی ہوئی، کچن کا گلاس نکالا جو انہوں نے فریج میں رکھ دیا تھا۔ ”یہ بی بی امال! بی بی امال ہو گیا ہوگا۔“

انہوں نے گلاس ٹیبل پر رکھا اور کاؤنٹر سے ٹرے اٹھائی۔ ”میں شاہ زیب کا کھانا لے کر جا رہی

ہوں۔

اس نے کچھ جواب نہیں دیا تھا۔ یوں ہی ٹھیل پر سر رکھے بیٹھی رہی۔ جب بی بی اماں چلی گئیں تو اس نے سر اٹھایا۔ ہم آنکھوں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔

”آزین اس طرح کیوں کر رہا ہے۔“

بہت سوچنے کے بعد بھی اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ ایسی کی بات ہوئی تھی جس نے آزین کا موڈ خراب کر دیا تھا بلکہ آنکھوں میں بھی پتھر ملی سی اجنبیت اور ساٹ پن تھا۔ اگر اسے میری کوئی بات پری لگی ہے تو اسے بتانا چاہیے تھا تاہم، آخر اتنی بے نظمی تو ہے تاہم اسے درمیان۔ اگر اس نے نہیں بتایا تو مجھے پوچھ لینا چاہیے، اس نے سوچا جب سب چلے جائیں گے تو پوچھ لوں گی۔ لیکن دل پھر بھی مضطرب اور بے چین سا تھا۔ اگر اس نے کہا کوئی بات نہیں۔ وہم ہے تو تمہارا تو۔ اگر اسے کچھ نہ بتانا ہوتا تو وہ یوں ہی کہتا تھا۔

اس نے ٹھیل پر پڑے گلاس کو دیکھا اور بی بی اماں نے آکر دیکھا کہ یہ اسی طرح پڑا ہے تو ناراض ہوں گی اس نے گلاس اٹھا کر یوں سے لگایا تب ہی بچن کے دروازے کو کسی نے انگلی سے بجایا اس نے نظریں اٹھائیں، شیخو بابا ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے کھڑے تھے۔

”آجائیں بابا نے کھانا کھالیا۔“

”جی!“ شیخو بابا نے ٹرے کاؤنٹر پر رکھی۔

”میں نے دو آئی بھی دے دی تھی۔“

”اور اب کیا کر رہے ہیں وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”طیافت سے کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے ہیں۔“

شیخو بابا ہمیشہ کی طرح نگاہیں جھکائے کھڑے تھے۔

”یہ تو اچھی بات ہے ورنہ اتنے سالوں سے انہوں نے بھی کتابوں میں دلچسپی نہیں لی۔“ وہ خوش

ہوئی تھیں۔

وہ جانے کے لیے مڑے۔ تو اسے ایک دم یاد آیا۔

”شیخو بابا! آپ نے اپنا اکاؤنٹ کھلوا لیا ہے۔“

”نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”کل رات بھی دادا جان کے پاس ظفر چاچو کا فون آیا تھا۔ وہ بہت تاکید کر رہے تھے۔“

”میں کیا کروں گا اکاؤنٹ کھلوا کر میری کون سی ایسی ضروریات ہیں جن کے لیے پیسے چاہئیں سب ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔“

وہ دروازے کے پاس رک گئے تھے۔

ظفر بابا نے جہاں زیب بیک سے کہا تھا کہ

مارکیٹ کے ادھر قلیٹ بنوانے کے علاوہ وہ چاہتے ہیں

کہ مارکیٹ کی دکانوں میں سے ایک دکان خالی

کروا کر شیخو بابا اس میں کوئی کاروبار شروع کر دیں۔

جس کے لیے وہ رقم بھجوانا چاہتے تھے۔ وہ بہت

شرمندہ تھے کہ وہ جب مسجد کی میز میوں پر بیٹھے شیخو بابا

کو گھرائے تھے تو انہوں نے امام مسجد سے وعدہ کیا تھا

کہ وہ اسے اپنے بیٹے کی طرح ہی رکھیں گے جب

امام صاحب نے کہا تھا کہ آپ کا تو ایک بیٹا ہے میں

سوچ رہا تھا کہ اس بچے کو کسی بے اولاد شخص کے

حوالے کر دوں اور وہ ان سے کیا وعدہ بھانہ سکے تھے

اور اب بتلا کر رہا چاہتے تھے۔

”کچھ تلافیاں بعد از وقت ہوتی ہیں۔ دادا

جان! لیکن شاید اب یہ بات نہیں جانتے۔“ تب دادا

جان کی بات سن کر آزین نے کہا تھا۔

اور اسے تو عادت تھی ظفر بابا کے حوالے سے

جلی گئی بات کرنے کی جہاں زیب بیک نے پروا نہیں

کی تھی اور ظفر بابا سے کہہ دیا تھا کہ وہ شیخو بابا کا

اکاؤنٹ کھلوا دیتے ہیں اور وہ ان کے اکاؤنٹ میں

رقم جمع کر دیں۔

”صرف کھانا پینا اور کپڑے جوتے ہی تو

زندگی کی ضروریات میں شامل نہیں ہیں تان، جب

آپ کی شادی ہوئی تو خاندان کی ذمہ داریاں اس معمولی ملازمت میں آپ نہیں اٹھا پا سکتے تھے اس لیے تو پچا جان چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی کاروبار سیٹ کر دیں۔ میں زین سے کہوں گی وہ خود آپ کے ساتھ جا کر آپ کا اکاؤنٹ کھلوا دے گا۔“

ٹھوڑی دیر کے لیے اس کے ذہن سے نکل

گیا تھا کہ آزین کا موڈ کتنا خراب ہے۔

”شیخو بابا کچھ کہتے کہتے رک گئے اور ”جی اچھا“

کہہ کر چلے گئے کہ بی بی اماں نے انہیں تان لانے

کے لیے کہا تھا۔

اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا، اور

خالی گلاس دھو کر ریک میں رکھا پھر کینٹ سے برتن

نکالے گئے۔ ڈولکس، پلٹین، یاؤل وغیرہ نکال کر

نڈرے میں رکھے۔ اب کیا کرے باہر جانے کو جی

نہیں چاہ رہا تھا وہ کاؤنٹر سے ٹپک لگائے کھڑی بچن

کے نیم اور دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ دل بیک دم جیسے

ہر جگہ سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک نظر برتنوں

پر ڈالی کہ ایک بار انہیں ”کھنگال“ کر رکھ دے۔

بی بی اماں کی عادت تھی کہ الماری سے برتن

نکال کر دھوئے بغیر استعمال نہیں کرتی تھیں۔ صاف

پانی سے دھو کر صافی سے خشک کرتی تھیں۔ لیکن وہ

یوں ہی سستی لائے کاؤنٹر سے ٹپک لگائے کھڑی رہی۔

”دوسروں کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کو نظر انداز

کر کے زندگی کو آسان بھی تو بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن پتا

نہیں ہم زندگی کو خود اپنے لیے کیوں مشکل بنالیتے ہیں

محض کسی چھوٹی سی بات کو لے کر اب یقیناً کوئی معمولی

سی بات ہوگی جسے لے کر آزین نے اپنا موڈ بھی

خراب کر رکھا ہے اور مجھے بھی تکلیف دے رہا ہے۔

وہ ایک بار پھر سوچنے لگی تھی کہ ان گزرے دنوں

میں ایسا کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے آزین ناراض لگ

رہا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے تو وہ مری جانے کا

پروگرام بنا رہا تھا۔

”لائگ ویک اینڈ ہے اور میں کچھ چھٹیاں لے

لوں گا تو مری چلتے ہیں سب۔ ماحول کی تبدیلی سے

پچا جان پر اچھا اثر پڑے گا۔ تنہا گلی میں ایک کوئیک کا اپنا کابج ہے۔ اس نے کہا ہے ہم لوگ وہاں رہ سکتے ہیں۔ کھوش پھر گئے انجوائے کریں گے اور دادا جان وہاں آپ کتابوں کا ڈھیر ساتھ اٹھا کر مت لے جائے گا۔“

”نہیں مار! ایک دو کتابیں تو ساتھ لے جانے

کی اجازت ہوگی نا۔“ جہاں زیب بیک سکرانے

تھے۔

”طیس ایک دو کی اجازت ہے۔“ وہ بے حد

خوش لگ رہا تھا۔

”اور تم زلی بی بی تم بھی ساتھ کتابوں کا ڈھیر نہ

اٹھا کر لے جانا۔ تمہاری بھی عادت دادا جان جیسی ہی

ہے۔“ اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بتایا

تھا۔

”پتا ہے زین! ایک بار یونی میں ایک لڑکی مری

کا ذکر کر رہی تھی تو میں نے کہا کہ میں تو بھی مری نہیں

گئی تو وہ اتنی حیران ہوئی بار بار پوچھتی تھی کہ تم نے

ابھی تک مری نہیں دیکھا۔“

”چلو اب مری سے آکر اسے بتا دینا کہ تم نے

مری دیکھ لیا ہے۔“ وہ ہنسا تھا۔

”لیکن اب تو یونی ختم اور وہ لڑکی پتا نہیں کہاں

ہوگی۔“ اسے جیسے افسوس ہوا تھا کہ وہ اب یونی نہیں

جانی۔

”چلو اب کسی نے پوچھا تو بتا دینا کہ تم نے مری

دیکھ رکھا ہے۔“

اور یہ ہفتہ پھر پہلے کی ہی تو بات تھی تب وہ کتنا

خوش تھا اور اس روز وہ اس کے گئے پر مساجد کے

ساتھ جا کر مارکیٹ سے جو کچھ بھی لے کر آئی تھی۔ جو

کچھ تھا اسی ایک ہفتے میں ہوا تھا۔

وہ اس ایک ہفتے میں ہونے والی چھوٹی سی

چھوٹی بات کے متعلق سوچنے لگی، تین بار مونا تانی کے

بلانے پر وہ اوپر گئی تھی۔ ایک بار ماہوش کی طبیعت

خراب تھی تو وہ اس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی

جس پر آزین نے ٹھوڑا سا ناراضی کا اظہار کیا تھا کہ ماہ

دش کے ساتھ رخسانہ تائی یا میمونہ تائی کو جانا چاہے تھا لیکن جب اس نے بتایا کہ سونا تائی کو سخت فلو ہو رہا تھا اور رخسانہ تائی کے پاؤں میں موج آگئی تھی جب کہ ماوش نے ناٹم لے کر لکھا تھا ڈاکٹر زیدہ سے۔

جب وہ خاموش ہو گیا تھا بلکہ اس روز تو انہوں نے بہت دیر تک باتیں کی تھیں۔ پھر رات کو وہ اسے اپنے ساتھ باہر آؤں کریم کھلانے بھی لے کر گیا تھا۔ پھر چار دن پہلے اسے ایک دم ٹھک ہوا۔

جس رات وہ آؤں کریم کھا کر آئے تھے اس سے اگلے روز صبح آؤں کریم کا موڈ بہت خوش گوار تھا اور اس نے ناشتے کی ٹیبل پر بی بی اماں سے کہا تھا اگلے ہفتے ان شاء اللہ ہم مری جائیں گے۔ بخوبیا کو بتا دیجیے گا۔ وہ جھٹی کی بات کر لیں۔ چچا جان ان کے ساتھ بہت اٹیچڈ ہیں تو وہ بھی ساتھ ہی جائیں گے۔

اور آؤں کریم کی نظریں جب بھی اس کی طرف اٹھیں جذبے لٹائی تھیں۔ اور جب وہ کھن کا دروازہ بند کرنے لگی تھی تو اس نے بے حد شوخی سے کہا تھا۔

”اچھی بیویاں ہمیشہ اسی طرح مسکراتے ہوئے صبح اپنے شوہروں کو آؤں کھاتے وقت رخصت کرتی ہیں۔“

اس کے رخساروں پر ہمیشہ کی طرح لالی بکھر گئی تھی۔

”میری خواہش ہے کہ تم ہمیشہ اسی طرح مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کرتی رہو۔ اور جب میں آؤں سے واپس آؤں تو صبح سنور کر مسکراتے ہوئے میرا استقبال کرو اور تمہاری مسکراہٹ میری دن بھر کی تھکن ختم کر دے گی۔“ اور پھر اسی روز میرا آئی گئی۔

وہ ہفتہ دن دن بعد چکر لگاتی تھی اب تو بی بی اماں سے بھی اس کی دوستی ہو گئی تھی۔

”تمہیں پتا ہے زل! ستمبر میں امر آؤں کونسل میں فن وثقافت کے پروگرام ہوتے ہیں۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ مطلب آرٹس آتے ہیں۔ آج موسیقی کا پروگرام ہے۔ بڑے بڑے فنکار ہوں گے۔ چلو آج میرے ساتھ۔“

”نہیں سیرا! میں تو کبھی کہیں نہیں گئی۔ میں کیا کروں گی جا کر۔“

”یہ کیا کہی نہیں گئی تو کیا ساری عمر نہیں جاؤ گی۔“ سیرا نے برا سا منہ بنا لیا تھا۔ ”گھر میں بڑے بڑے سڑی رہتا۔ باہر نکلا کر دیار بھی شایگ کے لیے بھی یوں ہی کی پارک میں، جناح باغ چلی جاؤ، اور نہیں تو چڑیا گھر ہی دیکھنے چلی جاؤ۔“ وہ ہنسی بھی دے دیا تھا۔

”ہاں بچپن میں ایک بار نظریہ چاچو لے گئے تھے ہم سب بچوں کو۔ صبحی چچی، اماں میں زمین سب ہی گئے تھے۔ بہت مزا آیا تھا۔ ہم نے وہاں فنی کھائی تھی۔ گول گے کھائے تھے اور پتا نہیں کیا کیا۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”اور گھر آ کر میرا آؤں کریم کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ امی والا کھانا پانی پینے سے پھر سب کچھ ختم ہو گیا سیرا خوشیاں اپنے پر پھیلائے ہمارے آؤں کریم سے اڑ گئیں۔ اور آؤں کریم نے سب کی آنکھوں سے دوستی کر لی۔ اماں، صبحی چچی، دادی جان، سب کی آنکھیں ہر لمحہ آؤں کریم سے بھری رہتی تھیں۔ پھر بھی کوئی خواہش گھونٹنے پھرنے نہیں جانے کی پیدا ہی نہیں ہوئی۔“

زندگی کسی ایک جگہ ٹھہرتی نہیں ہے۔ زل اسے آگے بڑھتا ہوتا ہے۔ تمہاری زندگی اب تک وہاں نہیں ٹھہری ہوئی ہے تم ایک چھوٹی بچی سے ایک جوان، خوب صورت، حسین لڑکی کے روپ میں داخل چکی ہو تو یار زندگی کو بھر پور طریقے سے انجوائے کرو، یہ ہمیشہ نہیں رہے گی۔ ایک دن ختم ہو جائے گی۔ چلو آج نہ کسی کل میرے ساتھ چلتا۔ میں آ کر لے جاؤں گی۔ کلینڈر آف ایونٹ پورے تین ماہ کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کالج سے بھی طلباء شرکت کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کل کیا پروگرام ہے شاید مشاعرہ ہو یا پھر اور کوئی ثقافتی پروگرام لیکن کل میں انکار نہیں سنوں گی۔“

”میں وہاں جا رہی ہوں گی سیرا۔“

”جو میں گروں گی۔“

”بی بی اماں!“ اس نے مدد طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ ”چلی جانا۔ جب سے پونیوڑی چھٹی ہے گھر میں ہی رہتی ہو۔ اچھا ہے دل نہل جائے گا۔ نہ نہیں آنا نہ جانا۔ خود بھی تو کہہ رہی تھیں بوریٹ ہو رہی ہے۔“

بی بی اماں نے سیرا کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

”لیکن بی بی اماں۔“

”لیکن وہیں کچھ نہیں بس بی بی اماں نے اجازت دے دی ہے تو میں کل لینے آ جاؤں گی۔“

فون کر کے بتا دوں گی کب جانا ہے۔“

سیرا کی عادت تھی یوں ہی فیصلہ سنانے کی اور وہ فیصلہ بنا کر چلی گئی تھی۔ اور جاتے جاتے وہ اسے یقین دلائی تھی کہ وہاں جا کر وہ ہرگز پونیوڑی ہوگی بلکہ اسے خوش گوار کی احساس ہوگا۔ ایسے ہی جیسے کوئی بند کرنے کی ٹھن سے باہر چلی ہو اس آجائے اور ایسا ہی ہوا تھا وہاں دو تین اور پونیوڑی فیلو بھی مل گئی تھیں۔ دادا جان نے بھی اجازت دے دی تھی اور آؤں کریم نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے، چلی جاؤ لیکن سیرا سے کہنا، خود گھر چھوڑ کر جائے یہ نہ ہو کہ واپسی پر کسی رکشے یا ٹیکسی میں بٹھا دے۔“

آؤں کریم بہت جلدی میں تھا اسے مرسل اور رضا کے ساتھ نہیں جانا تھا سو اس نے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی بس آؤں کریم سے آکر اپنا کمرہ اٹھایا تھا اور چلا گیا تھا۔

اس روز چاروں صوبوں کا ثقافتی پروگرام تھا۔ وہاں کے لوگ گیت فنکاروں نے سنائے تھے اور مختلف صوبوں کے لباس اور لوک داستانوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے خاکوں میں بتایا جا رہا تھا اس نے بہت انجوائے کیا تھا اور بہت خوش گوار موڈ کے ساتھ وہ امر آؤں کونسل کی عمارت سے باہر آئی تھی۔ وہاں وجدان احمد کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

”ارے آپ بھی آئے ہوئے ہیں سیرا نے تو“

”نہیں بتایا تھا۔“

”ہم صحافی لوگ ہیں انکی جگہوں پر ہمارا پایا جانا ہرگز حیرت انگیز نہیں ہے۔ آخر اسے کالم کا پتہ بھی تو بھربنا ہوتا ہے نا۔“ وہ سیرا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”آپ کالم لکھتے ہیں کس اخبار میں، ہمارے ہاں تو نوائے وقت آتا ہے اور“ لیکن سیرا نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی اور ہاتھ اوپر اٹھایا تھا۔

”تم دو منٹ یہاں روک زل، میں وہ کارڈ سے دو کوک پکڑ لاؤں۔ تم بھی پیو گے نا وجدان۔“

”تمہارے ہاتھوں سے تو زہر بھی پی لوں گا۔“

وجدان اب سیرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تب ہی چن کا نیم کا دروازہ کھلا اور ساجدہ اندر داخل ہوئی۔

”ارے ساجدہ تم اس وقت خیریت ہے نا۔“

”جی تو ٹھیک ہیں نا تمہارے۔“ وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

”ہاں سب خیریت ہے بی بی! بچے باپ کے ساتھ پارک میں گئے ہوئے ہیں۔ بخوبیا آئے تھے بلانے کہ بی بی اماں بلارہی ہیں۔“

ساجدہ دو گھنٹا چھوڑ کر رہی تھی۔ تین چار رشتہ داروں نے مل کر گھر کرائے پر لیا ہوا تھا۔ وقت بے وقت ضرورت پڑی تو اسے بلالیا جاتا تھا اور اضافی پیسے دے دیے جاتے تھے۔

اس سے پہلے کہ زل کچھ کہتی بی بی اماں ہاتھ میں بیج لیے اندر آئیں۔

”میں نے بلوایا ہے اسے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ یہ کھانا وغیرہ لگا دے گی اور بعد میں برتن دھو کر پین سمیٹ کر چلی جائے گی۔“

بی بی اماں کو بیج ناشتے کے وقت کچن صاف سہرا چاہیے ہوتا تھا سو رات کو کتنی بھی دیر ہو جاتی وہ یا زل رات کے برتن دھو کر اور پین سمیٹ کر ہی سوتی تھیں۔

زل نے نمون نظروں سے انہیں دیکھا۔ واقعی آج اس میں ہمت نہیں تھی اور بی بی اماں بھی سارا دن مصروف رہی تھیں۔

”شکر یہ بی بی اماں!“ اسے بی بی اماں پر بہت پیارا آتا تھا جو ماں سے بڑھ کر خیال رکھنے والی تھیں۔
”اور یہ تم اندر گری میں مٹس کر کیوں بیٹھی ہو۔ باہر جا کر بیٹھو تازہ ہوا سے طبیعت ٹھیک ہوگی۔“

اور وہ سر ہلاتی ہوئی باہر آئی۔ لیکن سے باہر چند لمحے رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ٹوبہ اور سمیرا تخت پر بیٹھی تھیں سیڑھیوں میں شانزہ اب بھی وہاں ہی بیٹھی تھی۔ حشر اور مہرین شاید اور پرانی گئی تھیں۔ مہرین تو ڈوبی دے کر آئی تھی یقیناً کھلی ہوئی ہوگی۔ اس نے محن کی طرف دیکھا۔ اماں کی ساتھ والی کرسی پر جہاں زیب بیگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی کبھار ان کے ساتھ آکر بیٹھ جاتے تھے وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی شانزہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

”تو سرا!“ وجدان احمد شاید اس کے آنے سے پہلے کوئی بات کر رہا تھا سو اس نے بات وہاں سے ہی شروع کی جہاں سے چھڑی تھی۔

”میں نے جو کچھ کہا غلط نہیں کہا۔ پچاس سالوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کیلنڈر تبدیل ہوتے رہے لیکن اس ملک کی تقدیر تبدیل نہیں ہوئی۔ پچاس سالوں سے طاقت اور اقتدار ان لوگوں کو مل رہا ہے جنہوں نے اس ملک کے لیے کچھ نہیں کیا۔ صرف اپنی جھینم بھری ہیں۔ اور قوم کو کیا دیا ہے غربت، مہنگائی، نا انصافی، رشوت، سفارتیں اقربا پروری، ناخواندگی بننے کا صاف پانی تک تو میسر نہیں ہے سب کو۔“ اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔

”پچاس سالوں سے یہ سیاست دان عوام کی امیدوں سے کھیل رہے ہیں۔ اقبال کے اشعار اور قائد کے اقوال سنا کر بیوقوف بن رہے ہیں۔ اور بے چاری عوام ہر نئے آنے والے دکھائے ہوئے خوابوں پر یقین کر کے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ اس کے لیے جانیں بھیلی پر رکھ لیتے ہیں۔ جانیں قربان کرتے ہیں لیکن ہوتا کیا ہے وہی عوام کا استحصال، انسانیت کا زوال، خود غرضی نے جی۔“

”تمہارا اعلق کس اپوزیشن پارٹی سے ہے اور تم

کے لیڈر مانتے ہو۔“ رضا کو کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا اور عمر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا اس نے یک دم پوچھا تو وجدان احمد نے اس کی طرف دیکھا۔
”میرا اعلق کسی پارٹی سے نہیں ہے اور لیڈر صرف ایک ہی تھا اور وہ تھا قائد اعظم محمد علی جناح قائد کے بعد اس ملک کو کوئی لیڈر نہیں ملا بانی سب سیاست دان تھے اچھے برے بھلے جیسے بھی تھے لیکن لیڈر نہیں تھے یہ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر بلٹ پروف گاڑیوں میں سفر کرنے والے غریبوں کے مسائل پر لمبی لمبی تقریریں ابھی دو ماہ پہلے آنے والے سیلاب سے متاثر ہونے والوں کے لیے کیا کیا ہے انہوں نے اپنے شیش محلوں کے جھروکوں سے جھانک کر صرف تسلیاں ہی دی ہیں۔ ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر سیلاب زدہ علاقے کا سروے کر کے بس ان کا فرض ادا ہو گیا؟ سیلاب زدگان تو اب بھی کھلے آسمان سے پڑے ہیں۔ انہیں صرف اپنے اقتدار سے مطلب ہے۔ عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار حاصل کرنے والے اسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔“

”وجدان احمد!“ جہاں زیب بیگ نے جو بے حد خاموشی سے اور دھیان سے اسے سن رہے تھے یک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ جو شاید ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا یکدم بوکھلا کر بولا۔
”جی سر۔“

”آپ شاید نہیں جانتے کہ 1947 میں جب پاکستان بنا تو یہاں کیا حالات تھے دفتار میں کامن نہیں تک نہیں تھیں۔ ذرا تھوڑی دیر کے لیے 1947 کے پاکستان اور آج کے پاکستان کا موازنہ کریں تو آپ کو ادراک ہوگا کہ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ پچاس اگیا دن سالوں میں یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔“

جہاں زیب بیگ اس طبقہ فکر سے تعلق رکھتے تھے جو پاکستان سے اندھی محبت کرتے ہیں اور اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے۔
”سر مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے۔ جب

لوگوں کے دلوں میں جذبہ تھا اس نے وطن کو خوش حال بنانے کا، لوگوں نے انفرادی طور پر ضمنتیں لگائیں۔ ملک میں آج جو ترقی نظر آرہی ہے۔ وہ ان ہی محبت وطن لوگوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ میں نہیں جانتا اس میں اس دور کے حکمرانوں کا کتنا ہاتھ تھا۔ کچھ تعاون تو بہر حال ضرور کیا ہوگا۔ میرے دادا اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں آئے تھے انہیں جنون تھا کہ ایسا کچھ کریں کہ پاکستان معاشی لحاظ سے سارے ملکوں کو پیچھے چھوڑ جائے۔ انہوں نے چند لوخر لگا کر چھوٹے سے کارخانے سے کام شروع کیا تھا آج میرے والد ایک بڑی ٹیکسٹائل مل کے مالک ہیں۔ حالانکہ بہت رکاوٹیں بھی آئیں تاہم ایک عزم تھا ولولہ تھا کہ وہ ہر رکاوٹ عبور کرتے گئے۔“

”یعنی۔“ جہاں زیب بیگ کے لیوں پر مدھمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارا قصور سیاست دانوں اور حکمرانوں کا نہیں ہے۔ عوام نے بھی ملک کی ترقی کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ ہر فرد اپنا مفاد سوچتا ہے اور اسے صرف اپنے ذاتی منافع و نقصان کی فکر ہے۔ ایک بات یاد رکھیں وجدان احمد! جب تو میں بصیرت و بصارت کھودیتی ہیں تو حکمران ان سے مختلف کیسے ہو سکتے ہیں۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں کا محاسبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا احتساب بھی کریں کہ آپ نے ذاتی طور پر اس ملک کے لیے کیا کیا سوائے لیڈروں کے پیچھے کھوکھلے نعرے لگانے کے۔“

”جی جی سر۔“
وجدان احمد نے پیشانی پر چپکتے پسینے کے قطرہوں کو دائیں ہاتھ کی پشت سے پونچھا۔
”وجدان احمد! آپ ہمیشہ سے جذباتی اور پر جوش ہیں یاد ہے آپ کو اپنی ان پر جوش تقریروں اور انقلابی فطرت کی وجہ سے ایک بار آپ یونیورسٹی سے نکلتے نکلتے بچے تھے۔“

پہلی بار جب وہ مرسل کے ساتھ آیا تھا تو انہوں نے اسے پہچان لیا تھا، وہ ایک پر جوش اور انقلابی

اسٹوڈنٹ لیڈر کے طور پر پہچانا جاتا تھا اور وہ بھی انہیں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ سر آپ آؤں گے۔“
”دادا ہوں۔“ وہ مسکرائے تھے اور اس کے جانے کے بعد انہوں نے خاص طور پر اس کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کا اعلق کی سیاسی پارٹی سے تو نہیں اور آؤں گے کہ کیا تھا کہ وہ ایک صنعت کار بیٹا اور خود بھی صنعت کار ہے۔ بھلا ایک صنعت کار سیاست دانوں سے کیا مطلب۔“ اور جب وہ آؤں گے کی سادگی پر مسکرا کر دے تھے۔ تمہیں کیا خبر یہ صنعت کار سیاست دانوں سے کتنے قائدے اٹھاتے ہیں۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صنعت کار ان کی سیاست چکانے کے لیے پیسہ خرچ کرتے ہیں اور سیاست دان برسرِ اقتدار آکر انہیں مراعات دیتے ہیں۔ ان میں ایسی مراعات بھی ہوتی ہیں جن کے وہ حق دار نہیں ہوتے۔“

”آپ یقیناً صحیح کہہ رہے ہیں دادا جان لیکن وجدان ایسا نہیں ہے۔ شاس کا مزاج سیاست دانوں جیسا ہے اور نہ ہی اس کے اندر صنعت کاروں والا غرور و تکبر ہے۔ مرسل اور رضا کالج کے زمانے سے اس کے دوست ہیں۔ میری ملاقات چند ماہ پہلے ہی مرسل کے گھر ہوئی تھی وہ مجھ سے سینئر تھا میں جس سال یونی میں گیا اس نے اسی سال شاید یونی کو خیر باد کہا تھا۔“

”بہر حال تم اسے بتا دینا کہ تم سب لوگ مل جل کر قلابی کام کرتے ہو اور کسی قسم کی سیاست یا سیاسی پارٹی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔“ لیکن اس کے باوجود آج جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکل کر شاہ زیب بیگ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر وہ ان کی طرف چلے آئے تھے موضوع گفتگو ملکی حالات تھے۔

”بہر حال۔“ وہ اٹھے۔ ”کیا آپ کو آؤں گے نے بتایا نہیں وجدان احمد! کہ یہاں پر سب قلابی کاموں کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں سیاسی بحث کے لیے نہیں۔“



فاطمہ بھی دوائیوں کی لائن میں لگی ہوئی تھی۔
تھوڑی دیر بعد دیکھا تو وہی اماں ایک کونے میں
پریشان کھڑی اپنے آنسو صاف کر رہی ہیں۔ اس کا
دل دکھ سے بھر گیا۔ اس نے اشارے سے اماں کو
اپنے پاس بلایا۔
”اماں! آپ کے پیسے پورے نہیں ہوئے؟“
بیٹا! پیسے تو پورے ہو گئے۔ اب دوا کے لیے
کھری ہوں۔ جو آتا ہے مجھے دیکھ ل کر آگے آ جاتا
ہے۔

فاطمہ نے اسے دوائیاں لے کر دیں تو وہ عورت
فاطمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیروں دعائیں دیتی ہوئی
رخصت ہوئی۔

دوائیوں وغیرہ سے فارغ ہو کر ایک جگہ بیٹھ کر
فاطمہ نے ایک کاپکٹ نکالا کھانے کے لیے (جو تکہ
سرکاری اسپتالوں میں صبح جلدی جانا ہوتا ہے، اکثر

”بیٹا! میری کچھ مدد کر دو میرا بونہ کھو گیا ہے
مجھے گھر جانا ہے، میرے پاس کرایے کے پیسے نہیں
ہیں، مجھے صرف ڈیڑھ سو روپے چاہئیں۔“
”دوائیوں کی لائن میں لگی عورتوں سے وہ
ضعیف عورت کہہ رہی تھی۔ کسی نے دس روپے، کسی
نے بیس روپے دیے۔ کچھ کہنے لگیں۔ ان عورتوں
کے پاس بھی مانتے کے نت نئے طریقے ہوتے ہیں۔
ہم تو خود پریشان ہیں۔“

فاطمہ نے بھی پچاس روپے دیے۔
”اماں! آپ کے پاس فون نمبر نہیں ہے؟ میں
فون کر دیتی۔ کوئی آپ کو آپ کے گھر سے لینے
آ جاتا۔“ فاطمہ نے اس عورت سے پوچھا۔

”بیٹا! نمبر بھی میرے بونے میں تھا۔ پتا نہیں
پر چیاں — نکالتے ہوئے بونہ گر گیا۔“ وہ عورت
بولی۔

دادا جان نہیں چاہتے کہ میرا ربط ضبط ان لوگوں سے ہو
جو کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہوں۔“
”تھینک گاڈ، سر ہمیشہ سے میرے آئیڈیل
رہے ہیں۔“

اس نے مطمئن سا ہو کر اوپر آسمان کی طرف
دیکھا۔ ”چھوڑو یا اس سیاست اور سیاست دانوں کا
ذکر، عمر سے اس کی غزل سننے میں کوئی۔“
رضانے کہا تھا سب نے ہی اس کی تائید کی۔
”چھوڑ دیا سب۔“

وجدان احمد نے ہاتھ کو ہلکا سا جھکا اور منگھٹانے

لگ۔ سکھ کے پھول
بدی کے کانٹے
دکھ کی گھاس
سب بکواس، سب بکواس
مرٹھی، مرٹھی، مرٹھی، رضا، اماں سب اس کے ہم
آواز ہو کر گانے لگے تھے۔

سکھ کے پھول
بدی کے کانٹے
سب بکواس، سب بکواس
سیرامی تالیاں بجاتی ہوئی تخت سے اٹھ کر
صحن میں آگئی تھی اب سب یہ بول دہراتے ہوئے
تالیاں بجا رہے تھے۔

1947 میں جب وجدان احمد کے چچا
یونیورسٹی میں تھے تو زاہد ڈار کے یہ بول ہر طالب علم کی
زبان پر تھے۔

سیرامیوں پر لان میں گروپ کی صورت کھڑے
طلباء گاتے نظر آتے تھے ایک روز اس کے چچا نے
اپنی یونیورسٹی کی باتیں سناتے ہوئے بتایا تھا سب سے
یہ بول وجدان احمد کی زبان پر بھی رہنے لگے تھے اور
اب تو اکثر یہ سب بھی جب تھک جاتے تو کورس میں
گانے لگتے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

”لیکن سراسر سیاسی بحث تو نہیں کر رہا۔“ وہ
جہاں زیب بیگ کا بہت احترام کرتا تھا ان کے علم
وفصل کا مداح تھا۔ لیکن وہ وجدان احمد تھا اپنا موقف
بیان کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔

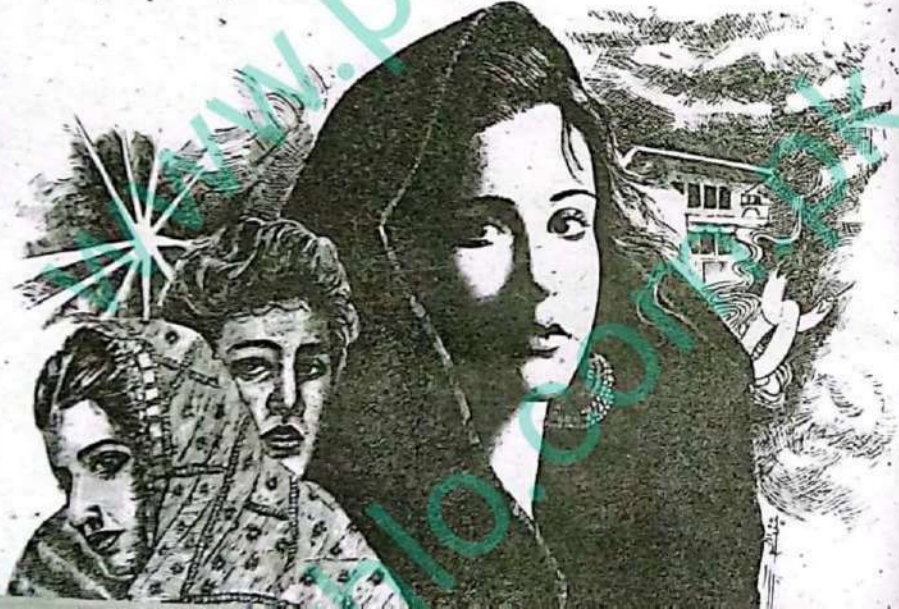
”میں تو ایک دردمند شہری کی حیثیت سے اپنے
وطن کی ترقی کا خواہاں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ
میرے لوگ بھی خوش حال ہوں میرا وطن بھی ترقی
کرے۔ لیکن جب میں اپنے حکمرانوں کو دونوں
ہاتھوں سے ملک کو لوٹتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے
تکلیف ہوتی کہ میرے دادا نے ہماری تربیت کی
بنیادوں میں وطن سے محبت کی اینٹ بھی رکھ دی تھی۔
میرا تعلق کسی سیاسی پارٹی یا لیڈر سے نہیں ہے لیکن میں
انتا جانتا ہوں کہ اگر عوام کو سیاست کا شعور نہیں ہوگا تو
پھر آمریت کا تسلط ہوگا میں جو کچھ کہتا ہوں۔ یہ میرا
سیاست شعور ہے کسی پارٹی یا لیڈر کی حمایت نہیں
ہے۔ آپ بھی تو کہا کرتے تھے جدا ہوئے سیاست
سے تو رہ جاتی ہے جو تکبیری۔“

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا لیکن جہاں زیب بیگ
نے جو مشکل وقت دیکھا تھا اس نے انہیں محتاط
کر دیا تھا کہ دودھ کا جلا چھانچہ بھی پھونک پھونک کر
پیتا ہے۔

”تو سیاست دانوں اور حکمرانوں پر تنقید کرنے
کے بجائے عملی طور پر کچھ کریں وجدان احمد! یہ بچے
اور آپ بھی جو کچھ کر رہے ہیں۔ یہ بھی وطن سے محبت
ہی ہے۔ بے سہارا اور ضرورت مندوں کے لیے کچھ
کر کے اور ان کے کام آکر بھی آپ وطن کی خدمت
سرا انجام دے رہے ہیں۔“

”سوری سر آئندہ احتیاط کروں گا کہ یہاں
سیاست اور سیاست دانوں کے حوالے سے کوئی بات
نہ کروں۔“

وہ سر ہلا کر شاہ زیب کے کمرے کی طرف بڑھ
گئے تو وجدان احمد نے پریشان سا ہو کر آئین سے
پوچھا۔ ”یہ سیرامی دماغ ہو گئے ہیں؟“
”نہیں۔“ آئین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بس



PARHLO PAKISTAN

اب آپ ہر قسم کے ناول ہماری ویب سائٹ
سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری ویب سائٹ ناولز راہٹرز کے لئے آفر
بھی دیتی ہے۔ اگر آپ لکھنے کے شائق ہیں تو ہم سے رابطہ
کریں۔ آپ کے ناولز کے علاوہ ناول کے بہترین ہونے
پر آپ کو کیش پرائز بھی دیں گے

ابھی اپنا ناول EMAIL کریں اور اپنے لکھاری ہونے کا فائدہ اٹھائیں۔

WHATSAPP GROUP : 0318-9992829

PARHLO.COM.PK@GMAIL.COM